سید محمد اشرف
نمبردار کا نیلا
ناولا

نمبردار کا نیلا

ناولا

سید محمد اشرف

کتب خانہ
پیپر بیک سیریز

نمبردار کا نیلا

(ناولا)

سید محمد اشرف

دوسری اشاعت: ۱۹۹۹

کتب خانہ پیپر بیک سیریز
زیرِ اہتمام: آج کی کتابیں

طباعت: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اردو بازار، کراچی

سٹی پریس بک شاپ

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 0623 565 (21-92)
ای میل: aaj@digicom.net.pk

انتساب

وطنِ عزیز مارہرہ شریف کے نام

فلک یک مطلعِ خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

نمبردار کا نیلا

ہوا بالکل خاموش تھی اور آر ہر کے اس لمبے چوڑے کھیت کو گھیرے میں لیے پچاس ساٹھ آدمیوں کی موجودگی کے باوجود غضب کا سناٹا تھا۔ پاگل نیلا اسی کھیت میں کسی جگہ موجود تھا۔ لاٹھیاں، ڈنڈے اور سانٹیں تھامے وہ سارے آدمی پنجوں کے بل چل رہے تھے اور پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ اگر کھڑی فصل میں سے نمودار ہو کر اپنے نکیلے سینگوں پر رکھ کر ریلتا ہوا، پٹخنیاں دیتا ہوا، کھُروں سے کھوندتا ہوا، لہولہان کرتا ہوا وہ بھاگے تو کیا ہو گا ـــ یہی سوچ ہر آدمی کے کانوں میں دھڑکن بن کر دھک دھک کر رہی تھی۔

اچانک ہوا چلی، آر ہر کے پودوں کی شاخیں آپس میں ٹکرا کر بجیں اور ہر آدمی کو وہ آواز نیلے کی بھگدڑ کی طرح محسوس ہوئی، اور ہر آدمی کے منہ سے ڈری ڈری سی چیخ نکل پڑی۔ جب کسی کے پاس بھی پودوں کو چیرتا ہوا نیلا نہیں نکلا تو سب کی جان میں جان آئی۔ طے یہ ہوا تھا کہ سب کے سب گھیرا بندی اس طرح کریں گے کہ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کا فاصلہ ایک لاٹھی کی لمبائی سے زیادہ نہ ہو، تاکہ اگر نیلا اچانک اندر سے حملہ کرے تو ہر آدمی کے پاس ایک لاٹھی کے فاصلے پر کم از کم دو بچانے والے موجود ہوں۔ دائرے میں چلتے چلتے اگر ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو جاتا تو دل دھڑکنے لگتا اور فوراً رفتار کچھ تیز کر کے یا دھیمی کر کے فاصلہ ایک لاٹھی کے برابر کر لیتے، جیسے عید کی نماز میں کن انکھیوں سے تکبیریں درست کی جاتی ہیں۔ گرمی اور خوف کے مارے سب کے ہاتھ لاٹھیوں پر پسیجنے لگے تھے۔ نتھو چچا نے کھوج دیکھ کر بتایا تھا کہ کھیت میں جانے کے کھوج تو ہیں، باہر نکلنے کے نہیں۔ یعنی نیلا یقیناً کھیت کے اندر ہے۔ نیلا یا تو بیٹھا تھا

یا ساکت کھڑا تھا۔ لیکن وہ اپنی دُم کو اتنی دیر تک بے حرکت نہیں رکھ سکتا۔ دُم ہلتی تو کسی ارہر کے پودے سے ضرور ٹکراتی۔ ٹکراتی تو آواز نہ ہوتی؟ لیکن کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ اس کا مطلب، وہ کھیت کے اندر ایک ایسا محفوظ گوشہ تلاش کر کے بیٹھا ہے جہاں فصل ماری گئی ہے اور پودے برائے نام ہیں۔ کھیت میں فصل کہاں کہاں ماری گئی ہے، یہ بات نمبردار اودل سنگھ اور ان کے نوکروں کو معلوم تھی۔ لیکن وہ کسی بھی سوال کا صحیح، براہِ راست اور فطری جواب نہیں دے رہے تھے۔ وہ صحیح جواب اس لیے بھی نہیں دے رہے تھے کہ وہ اس مہم میں براہ راست فریق بن کر سامنے آنا نہیں چاہ رہے تھے۔ بستی کی آبادی کے دباؤ میں وہ بمشکل اس بات پر راضی ہوئے تھے کہ ہانکا کر کے نیلا نکال کر اسے صرف اتنا مارا جائے کہ وہ باڑے میں بند کیا جا سکے۔ پچاس ساٹھ جوانوں کی تعداد کافی تھی اگر وہ فصل کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دیتے۔ طریقہ بھی یہی ہوتا ہے کہ جنگلی جانور اگر کسی فصل کے اندر چھپا ہوا ہو تو چاروں طرف سے گھیرا کر کے کچھ لوگوں کو فصل کے اندر داخل کر دیتے ہیں، شور مچا مچا کر جانور کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور جانور باہر نکلتے ہی داب لیا جاتا ہے۔ ٹھاکر اودل سنگھ کا خیال تھا کہ اس طرح فصل کے اندر داخل ہونے سے فصل برباد ہو گی اور ساتھ ہی ساتھ تُلسی کے پودے بھی پیروں تلے روندے جائیں گے، جس سے ان کی بے حرمتی ہو گی۔ لوگوں نے پوچھا، ارہر کے کھیت میں تلسی کے پودے کہاں سے آئے؟ ٹھاکر نے جواب دیا کہ یہ دراصل تلسی کا ہی کھیت تھا، ارہر تو کسی مجبوری کی وجہ سے اُگانی پڑی۔ لوگوں نے کہا کہ اتنے بڑے کھیت میں تلسی کی کاشت کے کیا معنی۔ تلسی تو گملوں میں بھی اگائی جا سکتی ہے کہ اس کا مصرف ہی کتنا ہے؛ کبھی کبھی نزلے زکام میں پتّیاں اُبال کر پی لیں یا کبھی کبھی پوجا کر لی۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے جواب دیا کہ تلسی کی فصل کا صرف اتنا ہی کام نہیں ہے۔ جب تلسی بڑھتی ہے تو اس کی پتّیوں میں سورج کی تیز چمک سے ایک خاص مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ اس مادّے میں ایک خوشبو ہوتی ہے۔ ہوا چلے تو وہ خوشبو دور دور تک جاتی ہے۔ جہاں جہاں تک وہ خوشبو پہنچتی ہے وہاں وہاں تک دیگر فصلوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو مار دیتی ہے۔ لوگوں نے کہا، ہم نے تو ایسا نہیں سنا۔ نمبردار اودل سنگھ نے کہا کہ اس کے ذمے دار وہ نہیں ہیں۔ تب لوگوں نے کہا، مگر تلسی کے پودے نظر تو نہیں آ رہے۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے

جواب دیا، ممکن ہے اندر ہوں۔ اندر جا کر میرے علاوہ تو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا، زیادہ تر تو ارہر کے پودے ہی ہیں، بلکہ ہماری نظر میں تو صرف ارہر کے ہی پودے ہیں۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے کڑک دار آواز میں کہا، نظر دھوکا بھی کھا سکتی ہے۔ اگر اسی دھوکے میں ارہر کی فصل کے ساتھ تلسی کے پودے بھی کچل گئے تو ذمے دار کون ہوگا؟ بولو، ذمے دار کون ہوگا؟ بولو، چپ کیوں ہو گئے؟ سب ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ سب نے خود کو یقین دلایا کہ ارہر کے بڑے کھیت میں یقیناً زیادہ تر تلسی کے ہی پودے ہیں اور تلسی کے پودے کچل جائیں تو شراپ لگے گا۔ دراصل اندر جانے کا خطرہ بھی کوئی مول لینا نہیں چاہ رہا تھا۔ اندر جانے کا مطلب تھا نیلے سے پہلا، براہ راست اور دوبدو مقابلہ، جہاں بھاگنے کی بھی جگہ کا امکان نہیں تھا۔ وہ لوگ دائرے میں چلتے رہے... پسیجی ہوئی لاٹھیاں تھامے، برابر کا فاصلہ رکھتے ہوئے، اپنی سانسوں کی آواز کو سنتے ہوئے، کھیت کی موہوم سے موہوم آواز پر کان رکھے ہوئے۔

ہوا چلی۔ شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ پورے کھیت میں ہوا کے بہاؤ کے رخ پر آوازوں کا ریلا آگے بڑھا۔ ان آوازوں کو لوگوں نے پھر نیلے کی بھگدڑ سمجھا۔ پھر سب کے منھ سے ڈری ڈری چیخیں نکلیں۔ ایک دوسرے کو چیختا سُن کر لوگوں کی چیخیں اور طویل ہو گئیں۔

ایک نسبتاً کم گھنے حصے میں ساکت منوں وزنی گوشت کا سیاہ تودا کنوتیاں ملائے کھڑا تھا۔ دُم تیزی سے بے آواز گردش کر رہی تھی۔ ہری خوراک کے پودوں کے ادھر چاروں طرف دیر سے ہلچل سنائی دے رہی تھی۔ مگر کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ کھیت محفوظ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے پودے بجتے تو وہ آواز اس کی مانوس آواز تھی۔ لیکن ان آوازوں کے بعد اچانک آدمی بھی چیخے تھے، اور ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ اس بار ابھی تک چیخیں تھمی نہیں تھیں۔ اسے لگا جیسے یہ چیخیں چاروں طرف سے بلند ہو رہی ہیں۔ اسے لگا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ اسے لگا لوگ اس کے بالکل نزدیک ہو گئے ہیں۔ اس کی دُم نے تیزی سے گردش کاٹی۔ اس نے اگلے کھُر مٹی میں مارے۔

باہر لوگوں نے محسوس کیا ان کی سہمی سہمی چیخیں جیسے ہی بند ہوئیں، اندر کھیت میں زوردار آوازیں پیدا ہوئی ہیں۔ اڑڑ... بھڑڑڑ... اڑڑ... بھڑڑڑ... کرتا ہوا نیلا ارہر کے مضبوط پودوں سے ٹکراتا ہوا پوری رفتار سے ایک طرف برآمد ہوا۔ ڈری ڈری چیخیں بلند ہوئیں۔ کچھ لوگوں کے

ہاتھوں سے لاٹھیاں چھوٹ گئیں۔ کچھ اندھادھند دوسری طرف بھاگے۔ کچھ نے ہمت کر کے لاٹھیاں بلند کر کے وار کیے۔ خون میں لہولہان سیاہ نیلا کھیتوں فصلوں کو پار کرتا ہوا سیدھا آبادی کی طرف دوڑا۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے نیلے کو اس کے بچپن سے پالا تھا۔ اس کے پالنے کی وجہ بھی عجیب وغریب تھی اور اس پر ابھی تک بھید کے پردے پڑے ہیں۔ اودل سنگھ بیک وقت دیہات، قصبے اور شہر کے باشندے تھے۔ تینوں جگہ ان کے مکانات تھے۔ گاؤں میں آبائی کھیت تھے اور حکومت، قصبے میں چیئرمینی اور شہر میں تجارت۔ وہ حکومت، تجارت اور سیاست تینوں کو برابر کا وقت اور اہمیت دیتے تھے۔ گاؤں میں گڑھی تھی، قصبے میں حویلی اور شہر میں کوٹھی۔ ایک دن گاؤں کی گڑھی میں چوری ہو گئی۔ پچاس تولے سونا، بیس سیر چاندی کے برتن اور دس ہزار روپے کے علاوہ گروی گانٹھ کے تیس چالیس سونے کے عدد بھی گئے۔ وہ قصبے سے اپنی جیپ میں طوفانی رفتار سے گاؤں پہنچے اور گڑھی کے دیہاتی پہرےداروں کے سر پہ اتنے جوتے بجوائے کہ ڈاکٹری معائنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ ان لوگوں نے روتے روتے اعتراف کیا کہ رات دوسرے گاؤں کی بارات میں کچھ لوگ آئے تھے، انھوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر بیڑیاں پیں اور ہمیں اپنی سگریٹیں پلائیں، سگریٹیں پی کر ہم بےہوش ہو گئے۔ گڑھی کے پیچھے پہرے کے کتے مُردہ پائے گئے؛ ان کے منھ سے نیلا نیلا پانی رِس رہا تھا۔ انھیں گوشت کے پارچوں میں کچلا دیا گیا تھا۔ جس دیہات سے بارات آئی تھی وہاں دوش دی گئی تو بارات کے گھرانے نے ان سگریٹ پلانے والوں سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ بتایا کہ ہم تو ان کو گھراتی سمجھے تھے۔ خیال کیا تھا کہ لڑکی والوں کے دور کے رشتےدار ہیں جو کسی اَور بستی سے بیاہ کے نیوتے میں آئے ہیں۔ ٹھاکر اودل سنگھ دانت پیس کر رہ گئے۔ وہ رات کا بےچینی سے انتظار کرنے لگے۔ جب رات ہوئی ــــ اور دیہات میں رات شام

کے بعد ہو جاتی ہے ــــ تو انھوں نے گڑھی کے دروازے بند کرا کے تیسرے دالان کے پیچھے والے کوٹھے میں جا کر اوپر جانے والی سیڑھیوں میں سیڑھی نمبر تین کی پٹیاں ہٹا کر معائنہ کیا اور اطمینان کیا کہ ڈالڈا کے تینوں ڈبوں میں وہ سارے سونے کے زیور ویسے کے ویسے ہی موجود ہیں جو اُدھار لینے والوں نے ضمانت کے طور پر رکھوائے تھے اور جو سُود ادا نہ کرنے کے تاوان میں ڈوب گئے تھے اور ٹھاکر اودل سنگھ کی دولت کے سمندر میں اُبھر آئے تھے۔ وہ لگ بھگ گیارہ سیر سونے کے زیور تھے۔ اس خزانے کو شہر کی کوٹھی میں رکھنے کا مطلب تھا انکم ٹیکس والوں کے خوف سے خود کو بے خواب رکھنا۔ قصبے کی حویلی میں جو خفیہ جگہ بنوائی تھی، اور جسے بنانے والے راج مستری کے کپڑے تعمیر کے دوسرے دن نہر کنارے پائے گئے تھے، وہ اس نقدی کے لیے ہی ناکافی تھی جو ٹھاکر اودل سنگھ نے شہر کے کولڈ اسٹور اور قصبے کی چیسَر مینی سے پیدا کی تھی۔ کولڈ اسٹور میں ۹۰ فیصد آلو ان کا خریدا ہوا تھا، لیکن حساب کی کتابوں میں اس کا اندراج دیہات کے کسانوں کے نام ہوتا تھا۔ ایک بار انکم ٹیکس افسر نے ان کسانوں کو نوٹس بھیج کر شہر کے آفس میں بلا کر چیکنگ بھی کی تھی۔ کسانوں نے سارے اندراجات اپنے نام میں قبول کیے۔ یہ سارے کسان وہ تھے جو ٹھاکر اودل سنگھ کی گڑھی سے برسات اور سردیوں میں اپنے گھر کے زیور رکھ کر قرضہ اٹھاتے تھے۔ جس دن کسانوں کے بیانات ہوے تھے اس سے دو دن پہلے ٹھاکر صاحب شہر کے وکیل کو لے کر گڑھی میں آئے تھے اور ان سارے کسانوں کو آنگن میں بٹھا کر سوال جواب کی تیاری کرادی تھی اور لال اور نیلی رسیدوں والی کتابیں دکھا کر ان سے پوچھا تھا:

"کیا تم یہ رسیدیں پہچانتے ہو؟"

"نہیں،" سب نے ایک آواز ہو کر کہا تھا۔

شہر کا وکیل ٹھاکر صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا اور جلدی جلدی سگریٹ پینے لگا۔ ٹھاکر صاحب نے دانت پیس کر سمجھایا کہ تم سب ان کتابوں کو پہچانتے ہو کیوں کہ ان پر تمھارے انگوٹھوں کے نشان ہیں۔ پھر انھوں نے سب کے انگوٹھوں کے نشان لگوائے۔

انکم ٹیکس دفتر میں کسانوں نے بیک آواز بتایا کہ "اب ہم ان کتابوں کو پہچانتے ہیں اور کولڈ اسٹور میں سارا آلو ہمارا ہی ہے اور ان کتابوں کو تلپٹی کہتے ہیں۔ اور ان پر ہمارے انگوٹھوں

کے نشان ہیں۔"

انکم ٹیکس آفیسر یہ سن کر چکرایا۔اس نے اپنے انسپکٹر کو دوسرے کمرے سے بلایا۔ انسپکٹر نے اسے پھر سمجھایا کہ "سر، میں خود کئی دنوں تک کسان کا بھیس بنا کر کولڈ اسٹور کے آس پاس گھوما ہوں۔ یہ سارا آلو کولڈ اسٹور کے مالک کا ہے۔ یہ کسان تیار کیے ہوئے ہیں۔"

آفیسر نے اپنے چیمبر میں آکر سب کا بیان کاغذ پر درج کیا۔ سب نے ایک ہی بات دُہرائی کہ ہم کسان ہیں۔ آلو پیدا کرتے ہیں۔ فصل پر آلو سستا ہوتا ہے تو ہم اسے کولڈ اسٹور میں رکھ دیتے ہیں۔ کولڈ اسٹور سے فصل کے بعد والے زمانے میں نکال کر یہ آلو اچھے داموں میں بیچ دیا جاتا ہے۔ سرخ نیلی تلپٹی پر ہمارے ہی انگوٹھے کے نشان ہیں۔"

ان کے چہروں پر کوئی زیادہ جھوٹ بھی نہیں برس رہا تھا۔ انھوں نے ایک ایک لفظ صحیح کہا تھا۔ صرف درمیان میں ایک جملہ اور بھی جوڑا جاسکتا تھا کہ صاحب فصل پر آلو پیدا ہوتے ہی ہم سے اونے پونے خرید لیتے ہیں کہ اُس وقت ہمیں ان کا بیاج ادا کرنا ہوتا ہے۔

افسر نے ان کے چہروں کو پڑھا اور کارروائی مکمل کر کے اطمینان کی سانس لی کہ کیس ختم کرنے سے پہلے ساری ضروری کارروائیاں مکمل ہو گئی تھیں ـــ کیس پڑھنا، شک کرنا، شک دور کرنے کے لیے نوٹس بھیج کر گواہوں کو بلانا، ان کے بیانات کا اندراج کرنا اور پھر فیصلہ سنا دینا۔ ٹھاکر صاحب نے آفس سے نکلتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کمر سے جھکتے ہوئے "صاحب" کا شکریہ ادا کیا اور اظہارِ افسوس کیا کہ آپ کو اس کیس میں خواہ مخواہ محنت کرنا پڑی اور اتنے لوگوں کے بیانات درج کرنا پڑے۔ صاحب نے خاکساری کے ساتھ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ "یہ تو ہمارا فرض تھا۔"

ٹھاکر صاحب چوری کے بعد کئی دن تک گاؤں میں آتے رہے۔ وہ روز شام کو گڑھی کی بیٹھک میں بیٹھ کر دانت پیستے رہتے اور ان نوکروں کو ماں بہن کی سناتے رہتے جنھوں نے چوروں کے ہاتھوں نشے کی سگریٹیں پی تھیں۔

ایک دن ایسے ہی بیٹھے تھے کہ باہر شور ہوا۔ نکل کر دیکھا تو گڑھی کی چار دیواری میں ایک مادہ نیل گائے دو بچوں کے ساتھ ہانپتی ہوئی ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر، وحشت کے عالم میں دوڑ رہی ہے اور دُھول اڑا رہی ہے۔ گیہوں کے کھیت کٹنے کے بعد کھیت میدان ہو گئے تھے اور چھپنے کی

جگہ نہیں بچی تھی۔ کتوں نے رگیدا ہو گا اور بے چاری بچوں کی کم رفتاری سے مجبور ہو کر گاؤں کی سمت بھاگ پڑی ہو گی۔ مادہ تو ٹوٹی ہوئی چاردیواری پھلانگ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ آگے جا کر رُک کر مڑ کر بچوں کی طرف دیکھا، دم تیزی سے ہلائی، پھر چاردیواری کی طرف بھاگ کر واپس آئی کہ کتوں نے پھر رگیدا۔ مجبوراً اسے کھیتوں کی طرف بھاگنا پڑا۔ بچوں کو، بھورے بھورے، بڑی بڑی آنکھوں والے، بڑے کتے کی جسامت کے بچوں کو پکڑ کر نیم کے درخت سے باندھ دیا گیا۔ ان میں کا ایک نیم کے درخت سے بندھا بندھا تیزی سے درخت کا طواف کرتا اور جب رسی درخت سے لپٹ جاتی اور گردن میں بل پڑنے لگتے اور آنکھیں اُبلنے لگتیں تو پھر مخالف سمت میں دائرے کاٹنے لگتا۔ اس نے درخت سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سورج غروب ہو رہا تھا تو وہ زمین پر گر کر تیز تیز سانس لینے لگا۔ خون کی اُلٹی ہوئی اور تھوڑی دیر بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ دوسرے بچے کی ٹانگیں باندھ دی گئی تھیں اور اسے نیم کے تنے سے سر ٹکرانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

اتنے میں گاؤں کے لوگ آ پہنچے۔ ایک بوڑھے نے تاسف کے ساتھ کہا "ہائے رے دیّا گنوماتا کا بدھ ہوئے گیا۔" ٹھاکر کی آنکھیں یہ سن کر چمکنے لگیں۔ انھوں نے بوڑھے کو ڈانٹ کر چپ کرایا اور بتایا کہ اگر ان جانوروں کو پکڑا نہ جاتا تو یہ گاؤں کے غریب کسانوں کے گھروں میں گھس کر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ننھے ننھے بچوں کو اپنے پیروں سے کچل ڈالتے۔ گاؤں والوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ آج ٹھاکر اودل سنگھ کی وجہ سے ان کے معصوم بچوں کی جان بچ گئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مرنے والا جانور کا بچہ کتنا جری اور قوی تھا۔ نیم کے تنے پر بچے کے سر کی مار کے نشان دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا جو بچہ بچ گیا ہے اسے وہ پالیں گے۔ کیوں کہ اول تو یہ گنوماتا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بڑا ہو کر اجنبیوں کو اپنے سینگوں سے لہولہان کر کے انھیں اپنے کھُروں سے کچل سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اسے کھلانے پلانے کا کوئی خاص خرچہ نہیں ہو گا؛ کبھی کبھی اپنے کھیتوں کا چارا بھی کھا لیا کرے گا۔ چوتھے یہ گوشت کے پارچے شوق سے نہیں کھاتا۔

ٹھاکر صاحب نے اسے اس انداز سے پالا کہ آدھا وقت وہ قصبے میں رہتا اور آدھا وقت گاؤں

میں کاٹتا۔ گاؤں کی گڑھی اور قصبے کی حویلی میں پانچ میل کا ہی تو فاصلہ تھا۔ وہ اسے نیلاکھہ کر پکارتے تھے اور لوگ اسے ٹھاکر کا نیلاکھہ کر بلاتے تھے۔

شروع شروع میں بہت دقتیں پیش آئیں۔ اول تو یہ کہ وہ وحشی تھا، کسی طرح بندھنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ پہلے اسے بھوکا رکھا گیا۔ بھوک نے اس کی وحشت کو کم کیا۔ پھر اسے خوب پیٹ بھر کر ضرورت سے زیادہ غذا دی گئی، تب خوش خوری نے اس کی وحشت کو بظاہر ختم کر دیا۔ گاؤں اور قصبے والے اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ٹھاکر اودل سنگھ اسے ہمیشہ باندھ کر رکھتے تھے۔ وہ ہرا چارا ناشتے میں کھاتا تھا، موٹے ناج کی سانی لنچ میں اور ڈنر میں ثابت ناج اور گڑ۔ کبھی کبھی سوپ کے طور پر اس کے منھ میں کھوکھلے بانس کا نلکا ڈال کر سرسوں کا خالص تیل پلایا جاتا۔ دو سال میں اس کا سینہ پُر گوشت، بدن سڈول اور سینگ ہلالی ہو گئے۔ ماتھے پر سفید بھنوری کے بال جگہ بنانے لگے۔ ایک دن ٹھاکر صاحب نے محسوس کیا کہ نیلا اب اتنا بڑا اور طاقت ور ہو گیا ہے کہ رسی کی بندش کو صرف عادت کے طور پر فرماں برداری میں قبول کرتا ہے، ورنہ چاہے تو ایک ہی زقند میں رسی اور رسی کے دوسرے سرے پر کھڑے بھوندو کسان کو لے کر اُڑ جائے۔

اگر رسی سے آزاد کردوں تو کیا بھاگ جائے گا؟ انھوں نے سوچا، اور کچھ یاد کر کے مسکرائے۔ رات میں گڑھی کے آنگن میں لیٹ کر انھوں نے پچھلے سال کا چیئرمینی کا الیکشن یاد کیا۔ ان کی موافقت کے ۷ لوگ ممبری کا چناؤ جیتے تھے اور مخالف امیدوار کی موافقت کے ۸ ممبران فتح یاب ہوئے تھے۔ ان ۱۵ ممبران کو چیئرمین کا انتخاب کرنا تھا۔ پچھلے بیس برس سے وہ بلاشرکت غیرے چیئرمینی کے تنہا امیدوار ہوتے آئے تھے۔ ممبروں کے ذریعے چناؤ محض رسمی خانہ پری ہوتا تھا۔ مگر اب زمانہ بدل رہا تھا۔ کچھ عجیب عجیب سے نعرے سننے میں آتے تھے کہ "ٹھاکر ہی کیوں بارم بار؟ نہیں چلے گا اک پریوار!" یا "ٹھاکر کو ہے ہٹانا، ہم کو بھی آزمانا..."

ابھی چیئرمینی کے چناؤ میں پانچ دن باقی تھے۔ مخالف کیمپ آٹھ امیدواروں کے ساتھ جیتا تھا اس لیے چناؤ سے پہلے ہی جشن منا رہا تھا۔ جشن کی آوازیں کانوں میں آتیں تو ٹھاکر کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ حویلی کی چھت پر کھڑی چارپائی پر لیٹے لیٹے رات گزار دیتے۔ چناؤ سے تین دن پہلے جھمن چمار ممبر غائب ہو گیا۔ پولیس میں گمشدگی کی رپورٹ لکھائی گئی۔ یہ رپورٹ ٹھاکر صاحب

نے لکھوائی تھی۔ ان کا بیان تھا کہ جھمن اندر ہی اندر ان کا موافق تھا۔ مخالف امیدوار محمود صاحب اس بات کو جان گئے تھے۔ انھوں نے اسے اغوا کرا کے اسے مروا ڈالا ہے۔ محمود صاحب کی طرف سے بھی رپورٹ ہوئی۔ اس کا لب لباب بھی وہی تھا۔ پولیس نے تفتیش تیز کر دی، یعنی دونوں امیدواروں کو قرقی کی دھمکی دے کر دونوں سے کہا گیا کہ چناؤ کے دن تک مقتول کو ہر حال میں حاضر کرنا پڑے گا۔ دونوں امیدواروں نے پولیس سے وعدہ کیا۔ دن میں ٹھاکر صاحب قصبے کی حویلی میں پولیس کے سب انسپکٹر انچارج کو کھانے کی میز پر تفتیش کراتے اور رات کو بارہ بجے کے بعد گاؤں پہنچ کر گڑھی کے تہہ خانے میں جھمن کو ڈنڈے پر کپڑا لپیٹ کر پٹواتے۔ چناؤ سے ایک دن پہلے انھوں نے جھمن کو سمجھایا کہ "ہمارا ساتھ دینے میں تمھارا جو فائدہ ہے اسے تم سمجھ نہیں پا رہے ہو۔ ایک تو یہ کہ تمھیں چیئرمین بننے کے بعد صفائی کا ممبر انچارج بنا دوں گا۔ صفائی کے عملے کی آسامیاں تم اپنی مرضی سے بھرنا۔ قصبے میں نل لگوانے کا کام بھی تمھارے ہی سپرد ہو گا۔ ۱۰۰ نل منظور ہوتے ہیں، کم از کم ۱۵ ضرور لگوانا ہوں گے۔ روزانہ سڑک کی نالیوں پر چونا ڈلوانے کا ایک بجٹ ہوتا ہے۔ اس پیسے کو تم دھرم کے کام میں لگا سکتے ہو جیسے اپنی بیٹی کی شادی کا کھانا اور کپڑے وغیرہ، کیوں کہ روزانہ چونا ڈلوانے سے نالیوں میں چونے کی لگدی جم جائے گی جس کی وجہ سے مزید گندگی کا خطرہ ہے۔"

انھوں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ شہر کے کچھ غنڈے اس کی لڑکی کو اغوا کر کے اپنے کام میں لانا چاہتے تھے جن کو ٹھاکر نے بڑی مشکل سے روکا ہے اور ان غنڈوں کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ جھمن ہمارا آدمی ہے۔ آدمی کیا ہمارا بھائی ہے، ہمارا موافق ہے، ہمیں ووٹ دینے جا رہا ہے۔

انھوں نے باتوں ہی باتوں میں یہ بھی سمجھایا کہ ان شہری غنڈوں نے یہ کام صرف ان کے کہنے کی وجہ سے نہیں کیا اور وہ یہ دھمکی دے گئے ہیں کہ اگر جھمن ٹھیک سے راضی نہیں ہوتا تو اس کا گلا کاٹ کر اس کے کپڑے خون میں بھگو کر محمود صاحب کے گھر کے پچھواڑے کھنڈر میں ڈلوا دو۔ یہ سن کر جھمن نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سلامت پایا تو ٹھاکر صاحب کا ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کیا۔

گڑھی کے خنک آنگن میں لیٹے لیٹے ٹھاکر صاحب نے پچھلے موسم کی اس رات کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا کہ کیسے انھوں نے اچانک ایک فیصلہ کیا تھا۔ وہ جھمن سے اچانک آواز بدل کر بولے تھے:

"جھمن، تُو کیا سمجھتا ہے کہ میں تجھے اپنی چیسٹر مینی کے لیے اٹھا کر لایا ہوں؟ نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔ ایسا وچار بھی من میں مت لانا... نہیں، تُو شاید اب بھی یہی سوچ رہا ہے..."

جھمن چپ چاپ کھڑا ہولے ہولے کانپتا رہا۔

ٹھاکر نے چہرے پر ایک خاص طرح کا سادھو سنتوں والا تیج پیدا کیا اور بھاری مصنوعی آواز میں بولے:

"چلو جھمن، تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آئیں۔ کل جسے دل چاہے ووٹ دینا۔"

وہ حیران کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔ ٹھاکر نے اس کی ٹانگوں سے رسی کھولی، پھر ہاتھوں کی رسیاں کھولیں، اس کی آنکھوں پر انگوچھا باندھا اور اسی عالم میں گاؤں سے لا کر قصبے کی عید گاہ کے پیچھے جا کر جیپ سے اتارا اور انگوچھا کھول کر اس کی چمچماتی آنکھوں میں دیکھنے لگے... دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ بھی انھیں دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے آج تین دن اور تین راتوں کے بعد اپنے پیروں اور ہاتھوں کو آزاد پایا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر ٹھاکر کا چہرہ دیکھا۔ اسے ٹھاکر کے چہرے کے چاروں طرف ایک ہالا سا نظر آیا جیسے رام لیلا کی تصویروں میں ہوتا ہے۔ ٹھاکر، جو ابھی تک اس کا ایک ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، سوچ رہے تھے کہ یہ ہاتھ چھوڑ دوں یا پکڑے رہوں، اس سے کچھ بولوں کہ کچھ نہ بولوں۔ جھمن نے اس ہاتھ کی پروا نہیں کی۔ اسے اپنی جان بچنے کی اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ اسے خیال ہی نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ ابھی تک ٹھاکر کی گرفت میں ہے۔

پو پھٹنے والی تھی۔ بیر کے درختوں میں تیتر بولا۔ نیک شگون لے کر ٹھاکر نے جھمن کی سوکھی کلائیوں میں قدرے اطمینان سے دوڑتے خون کی رفتار کو محسوس کیا اور ہاتھ کو آزاد ہونے کا جو واحد فائدہ جھمن کی سمجھ میں آیا وہ یہ کہ اب اطمینان سے جھک کر دونوں ہاتھ جوڑ سکتا تھا۔ اس نے یہی کیا۔

الیکشن میں ٹھاکر کو ووٹ دینے کے بعد اس نے تھانے میں یہ بیان دیا کہ وہ دل کے اندر

سے ہمیشہ سے ٹھاکر صاحب کا موافق رہا ہے۔ محمود صاحب کے ڈر سے وہ دلی بھاگ گیا تھا اور وہیں نظام الدین اسٹیشن پر تین دن تین راتیں گزار کر آیا ہے۔ پولیس سب انسپکٹر نے فائل رپورٹ کی اور حاشیے میں ٹھاکر صاحب کے تعاون کا جلی حروف میں ذکر کیا جواب چیئرمین بھی تھے۔

صرف ایک سال پرانی یاد میں بھی اتنا مزہ آسکتا ہے، یہ سوچ کر ٹھاکر کو اور لطف آیا۔ کھیتوں کی طرف سے ہوائیں لوریاں دیتی ہوئی آئیں۔ پہرے کے نوکروں کو گالیاں دے کر انھوں نے ہوشیار کیا، بندھے ہوئے نیلے کو ایک نظر پیار اور ایک نظر اختیار کے ساتھ دیکھا اور سو گئے۔ صبح اٹھ کر انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آسمان پر نگاہ پھینک کر دیکھا کہ پو پھٹنے میں کتنی دیر ہے۔ جب میلا میلا اجالا اتنا روشن ہو گیا جتنا پچھلے سال جھمن کا ہاتھ چھوڑتے وقت تھا تو انھوں نے کان لگا کر کوشش کی کہ کسی بیر کے باغ میں تیتر بول جائے۔ نہیں بولا۔ البتہ کوئی ٹیٹری زور سے چیخی۔ اسی کو تیتر کی آواز پر محمول کر کے انھوں نے آگے بڑھ کر نیم کے درخت سے بندھے نیلے کو رسی سے آزاد کر دیا۔ وہ رسی کھل جانے کے بعد بھی ویسے ہی کھڑا رہا، بلا تک نہیں۔

ٹھاکر صاحب نے زور سے آواز دے کر اپنے چھوٹے بیٹے اونکار کو بلایا۔ اُس کی آنکھوں میں رات کی شراب کا خمار تھا۔ نیلے کو آزاد دیکھ کر اس کا خمار ٹوٹا۔ اس نے حیرت سے اپنے باپ کو دیکھا۔ باپ نے چہرے پر کسی غیر ضروری تاؤ کو لائے بغیر مضبوط آواز میں دھیمے دھیمے کہا:

"ایسے ہی جھمن کو رام کیا تھا پیتے سال..."

نیلے نے یکایک اپنی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی محسوس کی۔ اسے محسوس ہوا کہ گردن میں جو موٹی سی چیز چبھتی رہتی تھی وہ دور ہو گئی ہے، اور اب چلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں محسوس ہوتی۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ اگر کبھی تیز چلنے کا دل چاہے تو رسی پکڑنے والے کا بوجھ بھی گھسیٹنا پڑتا تھا۔

اب سب کچھ کتنا ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے جبلّی طور پر اسے ایک خدشہ لاحق ہوا کہ اَور باتیں بھی تو تبدیل نہیں ہو گئیں۔ لیکن جب صبح ہرا چارا، دوپہر کو سانی اور رات کو ناج اور گڑ ملا تو اس نے طبیعت میں بہت چونچالی محسوس کی۔ وہ گڑھی کے چاروں کونوں میں گھومتا پھرا۔ ایک بار دروازے سے نکل کر باہر بھی گیا۔ گاؤں والے اسے کھلا دیکھ کر چونکے۔ کچھ بدکے، کچھ اس کی آزادی کے خیال سے خوش ہوے۔ نیلا تھوڑی دیر بعد واپس گڑھی میں آ گیا اور نیم کے درخت کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر ہی اندر گردن پر تناؤ محسوس ہوا۔ دراصل جب دھوپ اس جگہ آ جاتی تھی تو وہ اٹھ کر لمبی رسی گھسیٹتا ہوا درخت کے سائے والے حصے میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس پر دھوپ آ گئی تھی۔ روزانہ اسی گھڑی اسے اٹھ کر رسّی کی گرفت کے سہارے سائے میں جانا ہوتا تھا۔ اس لیے اسے دھوپ اور رسی کا تناؤ ساتھ ساتھ محسوس ہوا۔ لیکن جب وہ سائے کے حصے کی طرف بڑھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ آج رسی کا تناؤ گردن پر نہیں تھا۔ وہ اگلے دونوں پیر زمین پر مار کر اگلے دھڑ سے اٹھا اور نیم کے تنے پر اپنے سر سے ایک سبک سی ٹکر ماری۔ یہ آزادی کے رقص کی پہلی تال تھی۔

ٹھاکر صاحب نے آہستہ آہستہ اسے کچھ افراد سے مانوس کر دیا، جس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دیگر افراد کو تھوڑا تھوڑا سا غیر سمجھنے لگا۔ قصبے میں جس صبح انھیں یہ خبر ملی کہ رات نیلے نے گڑھی کی دیوار پھلانگ کر شیشم کی سوٹ چرا کر بھاگنے والے شامو کی کمر توڑ دی ہے تو مارے خوشی کے حویلی میں ناچے پھرے۔ گاؤں پہنچے اور نیلے سے منھ میں کھوکھلا بانس ڈال کر اپنے ہاتھ سے ایک سیر تیل پلایا۔ تیل پی کر وہ اُچھلنے لگا۔ ٹھاکر نے بیٹھک میں آ کر گاؤں کے ہجوم کو دیکھا جو نیلے کی شکایت لے کر آیا تھا اور صرف ایک ہی بات کہی:

"رات کے دو بجے شامو گڑھی میں کیا پوجا کرنے آیا تھا؟ بولو۔ جواب دو۔ چپ کیوں ہو؟"

ظاہر ہے کہ اس بات کا جواب کون دیتا، کہ رات کو دو بجے واقعی پوجا کا کوئی مناسب وقت نہیں ہوتا۔

"یہ گئوماتا کا اوتار ہے۔ دُشٹ لوگوں کا ٹھیک ٹھیک پربندھ رکھے گا۔" ہجوم اٹھ کر چل دیا۔ کچھ بڈھوں نے گڑھی سے نکلتے وقت کن انکھیوں سے نیلے کو دیکھا جو اگلے پیر زمین پر مار مار کر

دھول اُڑا رہا تھا- کچھ لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر اوتار کو پرنام کیا-

گڑھی میں رکھے زیورات کی حفاظت کے اس انوکھے انتظام سے ٹھاکر کا رواں رواں خوش ہو گیا- نیلا کبھی کبھی قصبے کی حویلی میں بھی رات گزارتا تھا- ٹھاکر نے یہ بھی سوچ سمجھ کر کیا تھا، تاکہ قصبے اور دیہات دونوں پر نیلے کی یکساں دہشت قائم رہے- نیلا ابھی پٹھا تھا، مکمل بالغ نہیں ہوا تھا، اس لیے مستی میں نہیں آتا تھا- اس لیے وہ ان کے ساتھ کتے کی طرح رہتا تھا... ساتھ ساتھ... وفادار... آگے پیچھے... دائیں بائیں...

دیہات کی کھیتی باڑی، گروی گانٹھ کا کام، سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا- نیلے کی وجہ سے چوروں سے بھی خوب حفاظت تھی- اسی طرح قصبے کی حویلی میں کبھی کبھی رات گزارنے کی وجہ سے وہاں بھی چوروں کا خطرہ نہیں رہا- اب تو کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگا کہ چور تو چور، جو لوگ حویلی یا گڑھی میں اپنا حق لینے آتے، جیسے گیہوں کاٹنے والے اپنی مزدوری کا گٹھا یا چھت پر مٹی ڈالنے والے مزدور اپنے حصے کا اناج، تو اُن پر بھی نیلا دوڑ پڑتا تھا- وہ لوگ ٹھاکر سے منت سماجت کرتے، نیلے کی کارکردگی کی مبالغے کے ساتھ تعریف کرتے، تب ٹھاکر خوش ہو کر انھیں ان کا حق دیتے-

دیہات اور قصبے کی طرف سے جب فراغت محسوس ہوئی تو ٹھاکر نے شہر کی تجارت میں توجہ بڑھائی- دیہات والی چوری کے سانحے کے بعد اُدھر وقت نہیں دے پائے تھے- شہر کی تجارت بھی زوروں پر چلنے لگی-

ویسے تو نیلا زیادہ تر کام معمول کے مطابق کرتا تھا، یعنی دیہات میں رہتا، کسی بھی کھیت میں دو چار منھ مار دیتا، کہ جانور یہ تفریق نہیں کر سکتے کہ یہ تیرا ہے یہ میرا ہے- کبھی کبھی گڑھی سے تالاب کی طرف جاتے ہوئے اگر گلی تنگ ہے تو وہ راستے میں ملنے والے افراد کے درمیان سینگوں سے راستہ بنا لیتا- یہ بات بھی ہر فرد بشر آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ سینگوں کے بجائے اگر کھُروں سے راستہ بناتا تو اس میں لوگوں کو زیادہ زخم آتے- کبھی کبھی یوں ہی دولتی بھی چلا دیتا جس سے ان لوگوں کے کپڑے اور کپڑوں کے نیچے ذرا کھال وغیرہ بھی پھٹ جاتی- معلوم نہیں کیوں لوگ باگ بیچ راستے میں چلنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں-

اسی طرح جب وہ قصبے میں ہوتا تو کبھی کبھی پڑوس کے کسی بھی گھر میں گھس پڑتا اور مٹی کے برتن وغیرہ توڑ کر شاداں واپس آتا۔
ٹھاکر نے شکایت کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ نیلے نے آج تک کسی کے تانبے پیتل کے برتن نہیں توڑے، ہمیشہ مٹی کے توڑے۔ ٹھاکر چاہتے تھے کہ لوگ نیلے کی اس حسِ تفریق کی داد دیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اس سے بیزار ہونے لگے۔ خصوصاً دیہات میں لوگ اپنے کمزور کواڑ دن میں بھی بند رکھتے۔

قصبے میں بھی نیلے کو دور سے دیکھتے ہی اہم چیزیں چھپالی جاتیں اور دروازے اگر کھلے ہوں تو بند کر لیے جاتے۔ ٹھاکر نے لوگوں کی اس بیزاری کو بہت بُرا سمجھا۔ انھیں اکثر خیال آتا کہ وہ کیسے لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں، جن میں ذرا بھی حسِ مزاح نہیں... ذرا بھی چونچالی نہیں۔

ایک دن گلفام کنجڑا شام کو روتا ہوا قصبے کی حویلی پر آیا اور بیٹھک میں ٹھاکر کے پیر پکڑ لیے۔ اس نے احوال بیان کیا کہ وہ خوانچہ لگا کر امرود بیچ رہا تھا کہ بغیر کسی اشتعال کے نیلے نے آ کر پہلے تو اس کے پانچ عدد امرود کھائے۔ جب اس نے نیلے کو دھکا دیا تو نیلے نے باقی امرودوں کو کچل دیا۔ جب اسے اس حرکت سے روکا گیا تو اس نے گلفام کے اوپر دو پیروں سے حملہ کر دیا جس سے اس کا بازو زخمی ہو گیا اور قمیص پھٹ گئی... وہ اس کا ہرجانہ چاہتا ہے۔
ٹھاکر نے اس کی بات توجہ سے سنی۔ بلکہ کئی بار واقعات کو بیچ بیچ میں روک روک کر نئے سرے سے سنا۔ اس درمیان انھوں نے نوکر بھیج کر کچھ پاس پڑوس کے، کچھ بازار کے آدمی بلوا لیے۔ جب سب آ کر گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور گلفام نے ساتویں دفعہ واقعہ بیان کر لیا تو ٹھاکر نے اس سے ایک عجیب شانِ بے نیازی کے ساتھ پوچھا:

"آج کا تہہ بازاری کا پیسہ بھرا تھا؟"

"نہیں سرکار۔ خوانچہ بڑھا کر ٹھیکے دار کو دیتا۔ شام کو دیتا۔"

"تہہ بازاری کا مطلب ہوتا ہے بازار میں بیچنے کے عوض اس سرکاری جگہ کا روزانہ کا کرایہ۔ اتنا تو تم جانتے ہوگے؟"

"ہاں سرکار۔"

"اگر تم نے اس وقت تک تہہ بازاری کا پیسہ نہیں بھرا تو اس کا مطلب صبح سے شام تک تم غیر قانونی انداز میں بیٹھے۔ بولو۔ جواب دو۔"

گلفام چپ رہا۔ یہ نکتہ اس کی سمجھ میں عام حالات میں بھی نہ آتا، نہ کہ اس زخمی حالت میں جب کہ اس کے امرودوں کا نقصان بھی ہو چکا تھا۔

"بولو... بھائی، کچھ تو بولو... میں تمھیں پورا موقع دیتا ہوں۔ میں اُن لوگوں میں نہیں جو دولت اور کرسی کے نشے میں غریب کو بولنے بھی نہیں دیتے اور اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے بیٹھے ہوئے تمام افراد کے چہرے پر آئے نئے قسم کے تاثرات کا معائنہ کرنا ضروری خیال کیا۔ تاثرات کچھ کچھ۔ حسبِ منشا تھے۔ تجربے نے انھیں بتایا تھا کہ کبھی کبھی کچھ دیر خاموش رہنا بولنے کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ وہ چپ ہو گئے۔ بلکہ خاکساری کے انداز میں سر بھی نیچے جھکا لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے دھیمے سے فیصلہ کن انداز میں کہا:

"آج تم نے تہہ بازاری کی چوری کی۔"

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر انھوں نے اس سے بھی زیادہ دھیمی لیکن مضبوط آواز میں سوال کیا:

"تمھارے کتنے امرود کھائے؟ دس، آٹھ، چار یا پانچ؟ تم اس بات کو سات دفعہ دہرا چکے ہو۔ میں اپنے کانوں سے چھ بار سن چکا ہوں، جب سے یہ پندرہ لوگ یہاں بیٹھے ہیں تم کئی بار اپنے امرودوں کی تعداد بدل چکے ہو۔ بولو کتنے امرود کھائے؟ سات یا چھ؟ ان پندرہ لوگوں کے سامنے جواب دو۔ میں تمھیں نو مرتبہ موقع دے چکا ہوں۔ بولو... سچ کہ جھوٹ؟ جواب دو..."

گلفام بولا:

"نیلے نے میرے پندرہ امرود یا سات امرود یا شاید نو امرود یا میرے خیال میں دو امرود کھائے تھے۔"

سب ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔ گلفام ان کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا رہا۔

"آپ لوگوں نے دیکھا یہ کتنی بار امرودوں کی گنتی بدل چکا ہے۔ اب اس کی کس بات کا یقین کریں۔ خاص طور سے اس حالت میں کہ آج اس نے تہہ بازاری ٹیکس کی چوری بھی کی۔"

"سرکار! بلے نے میرے ہاتھ پر لات چلائی اور خونا خون کر دیا،" گلفام سسکنے لگا۔
ٹھاکر نے تمام افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
"آپ دھرم ایمان سے بولنا، ہمارا نیلا جو ہاتھی کے برابر ہے اگر اس لونڈے کو لات مارتا تو کیا یہ زندہ بچ سکتا تھا؟ کیا اس کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ نیلے نے اس کو لات ماری؟ جب کہ خود یہ اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ اس نے بغیر کسی اشتعال کے نیلے کو دو مرتبہ دھکا دیا..."
"سرکار! جب اس نے میرے امرود کھائے تب دھکا دیا تھا۔"
"کون سے امرود، جن کی صحیح گنتی بھی تم ان پنچوں کے سامنے نہیں بتا پائے ہو؟"
کیوں کہ اب وہ پندرہ آدمی پنچ تھے، اس لیے ان کا منصف مزاج ہو کر سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کرنا ضروری تھا۔ ان میں سے چند ایک کے چہرے پر ججوں جیسی سنجیدگی اور کرختگی بھی آ گئی تھی۔

فرداً فرداً ان پندرہ آدمیوں نے گلفام سے مختلف نوعیت کے پندرہ پندرہ سوالات پوچھے۔ گلفام نے ہر سوال کا جواب نہایت غلط دیا، یعنی ان پنچوں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ اس دوران ٹھاکر بالکل چپ رہے۔ ان کے بولنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اب اگر بولتے بھی تھے تو چاروں طرف سے سوالات کے نرغے میں گرفتار گلفام کی طرف داری میں ہی کوئی جملہ ادا کرتے۔ ان کی اس غیر جانبداری بلکہ خود مخالفانہ رویے نے پنچوں پر بہت اچھا اثر مرتب کیا۔ سب گلفام کو ملامت کرنے لگے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو سبھوں کا فیصلہ یہ تھا کہ گلفام باغوں سے امرود چرا کر بیچتا ہے اور اس پر یہ دھاندلی بھی کرتا ہے کہ تہہ بازاری کا ٹیکس ادا نہیں کرتا۔ آج اس نے ایک مزید سینہ زوری کرنے کی کوشش کی، ایک معصوم گئوسمان بچھو پر حملے کا الزام لگایا جو بیچارہ شام کے وقت ٹہلنے کے لیے بازار کی سڑک پر بائیں کنارے کی طرف دب کر ٹریفک کے اصول کے مطابق چل رہا تھا۔ یقیناً گلفام نے مزہ لینے کے لیے، جیسا کہ اس طرح کے اوباش لڑکے کرتے ہیں، اس بے زبان جانور پر دو یا پانچ یا سات یا نو دفعہ کچے سخت امرود مارے جس سے ممکن ہے جانور کو چوٹ آئی ہو۔ گلفام سو مرتبہ اٹھا بیٹھی کرنے اور ٹھاکر صاحب سے معافی مانگے۔
گلفام نے سو مرتبہ اٹھا بیٹھی کرنا چاہی تو ٹھاکر نے اٹھانوے پر پہنچ کر اسے روک دیا، اور

پنچوں کی طرف دیکھ کر کہا:

"اب بس کیجیے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ میرا دل بہت نرم ہے۔"

ان کے لہجے میں آنسو دیکھ کر لوگوں نے گلفام کو روکا۔ جب گلفام اپنا ٹوٹا ہوا خوانچہ اور باقی ماندہ امرود لے کر آنکھوں میں آنسو بھرے حویلی سے باہر نکلا تو دروازے پر نیلا کھڑا زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ پنچوں نے اسے للکار کر کہا:

"ارے اب اس بےزبان کو امرود تو کھلا دے بتیارے..."

بتیارے نے خوانچہ زمین پر رکھ کر آنسو خشک کیے اور امرود دونوں ہاتھوں میں بھر کر بےزبان جانور کے سامنے پیش کیے۔

❖

جب دولت، سیاست اور اقتدار تینوں حاصل ہوں تو بگڑی بات بنانے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی ــــ ایک دن ٹھاکر اسی فلسفے پر غور کر رہے تھے تو ان پر ایک عجیب وغریب انکشاف ہوا کہ جب سے وہ دیہات اور قصبے کی دولت کی حفاظت سے بےفکر ہوے ہیں، سیاست اور تجارت میں خوب وقت دینے لگے ہیں اور ان کی توجہ اور وقت دینے کی وجہ سے سیاست اور تجارت پہلے سے کئی گنا ترقی پر ہیں ــــ یعنی ان سب ترقیوں کے پیچھے اس نیلے کا ہاتھ ہے۔ انھیں یہ بات مضحکہ خیز محسوس ہوئی۔ مگر وہ جتنا غور کرتے اسی نتیجے پر پہنچے کہ ان کی حالیہ ترقی میں نیلے کا بہت عمل دخل ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح تھی، دیہات اور قصبے دونوں میں لوگ ٹھاکر صاحب سے زیادہ نیلے سے خوف کھانے لگے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ ٹھاکر صاحب اگر براہ راست کسی کو کوئی گزند پہنچائیں گے تو اس کی تو دادفریاد ہے لیکن نیلے کی کسی حرکت کی دادفریاد اس لیے نہیں ہے کہ اس کی حمایت میں ٹھاکر صاحب کے علاوہ بہت سے غیرجانبدار لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ کوئی نیلے کو برا کہہ کر خواہ مخواہ شراپ بھی نہیں لینا چاہتا تھا کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے مختلف لوگ

گاتھاؤں سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نیلا بھی گنوماتا کے بہت ہی قریبی عزیزوں میں ہوتا ہے، یعنی تقریباً کزن جیسا ــــ انھوں نے کزن کا ہندوستانی ترجمہ کر کے بھی بتایا تھا۔

آہستہ آہستہ صورتِ حال کچھ یوں ہو گئی کہ جو لوگ نیلے سے مضروب ہوتے وہ بھی اس بات کا کھلم کھلا اعتراف نہ کرتے، مبادا انھیں کی کوئی غلطی سامنے آجائے... صورتِ حال کو اس حد تک پہنچانے کے لیے کئی واقعات عالم ظہور میں پیش آئے، جن میں کچھ دیہات میں وقوع پذیر ہوئے اور کچھ واقعات کے لیے قدرت نے قصبے کا انتخاب کیا۔

⁂

دیہات میں گڑھی کے ٹھیک سامنے ننھو کمہار کی بیوہ اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ننھو کمہار کا پچھلے دنوں عارضۂ دق میں انتقال ہو گیا تھا۔ صبح تین بجے اٹھ کر تینوں ماں بیٹیاں گدھوں کو لے کر نکل پڑتیں اور دور دور کے تالابوں کی مٹی کھود کر گدھوں پر لاد لاد کر صبح منھ اندھیرے واپس آجاتیں۔ پھر گارا تیار کرتیں۔ کمہار کی جوان بیٹیاں پنڈلیوں تک گارے میں کھڑی، لہنگا ذرا ذرا سا اُڑسے ہوئے، پھاوڑے سے گارے کو نرم کرتی رہتیں۔ ماں چاک پر بیٹھی برتن ڈھالتی رہتی۔ چار پانچ دن کی محنت کے نتیجے میں جب اتنے برتن بن جاتے کہ بھٹی سلگا کر پکائے جاسکیں تو اُپلوں کی بنیاد بنا کر پولے پولے ہاتھوں سے کچے کچے برتنوں کو اس انداز سے سجایا جاتا کہ ان کے بیچ سانس کی جگہ باقی رہے، تاکہ آگ کی گرمی کی لہریں درمیان سے گزر کر تمام برتنوں تک پہنچ سکیں۔

ٹھاکر کے چھوٹے بیٹے اونکار کو کمہار کی بڑی بیٹی کے برتن بہت پسند تھے۔ مگر وہ اونکار کو ہاتھ لگانا تو ایک طرف، نظر بھر کر دیکھنے بھی نہیں دیتی تھی، پلو سے چھپائے رکھتی تھی۔ اونکار اکثر گڑھی کی چاردیواری کے دروازے میں مونڈھا ڈال کر بیٹھ جاتا اور دس قدم دور گارے میں ابھرتے ڈوبتے کمہار کی لونڈیوں کے پیروں کو تاکتا رہتا۔ سانولے پاؤں اور اُجلے تلوے گارے میں ڈوبتے اور ابھرتے، اسی رفتار سے اونکار کا دل بھی ڈوبتا اور ابھرتا... وہ بیٹھا دیکھتا رہتا کہ لڑکیاں اس کی

طرف سے منہ پھیر کر گارے کو اپنے پیروں سے دبا دبا کر نرم کر رہی ہیں۔ وہ وہیں بیٹھا بیٹھا گارے کی طرح نرم ہوتا جاتا اور اپنے اندر مختلف شکلوں کے برتنوں کو ڈھلتا ہوا محسوس کرتا رہتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ بڑکی نے گارے کی چھینٹوں سے بچنے کے لیے اپنے لہنگے کو تھوڑا سا اونچا کر کے نیفے میں اڑس لیا ہے۔ وہ پنڈلیوں سے ذرا اوپر تک کھل گئی تھی۔ اونکار اس کا بدن پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ میلے میلے اُلجھے بالوں کے نیچے چمکتی ہوئی سانولی گردن، گردن کے نیچے دبلی پتلی سڈول کمان کی طرح کھنچی ہوئی کمر، پشت کے نیچے گارے کو تھپکی دیتے پیروں کی دھمک سے ہلتے ہوئے کولہے، پیوند لگا لہنگا اور گھٹنوں کی پشت کا پنڈلی کا سب سے اوپر کا حصہ جو موٹی موٹی کھنچی ہوئی رگوں کے بیچ ایک اُبھار کی طرح واضح تھا اور جس میں اونکار کھڑے ہو کر اپنی شکل دیکھ سکتا تھا...

اونکار کو معلوم تھا کہ اُس کی شادی پڑوس کے گاؤں میں طے ہو چکی ہے۔ لڑکا بھی ذات کا کمہار ہے اور انٹر کا امتحان دے رہا ہے۔ اونکار کسی بھی قیمت پر بڑکی کو شادی سے پہلے ایک رات کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پرتاپ نے اسے اشاروں اشاروں میں منع بھی کیا تھا کہ اس میں پتاجی کی عزت کا سوال ہے، لیکن اونکار پر روزانہ گارے کی تھپکی کا جادو چڑھ چکا تھا۔ آج اس نے پہلی بار بڑکی کی ٹانگوں کو اتنا کھلا ہوا دیکھا تھا... اس نے موٹرسائیکل اٹھائی اور قصبے میں جا کر راکیش کو پوری بات بتائی۔ ٹھاکر اودل سنگھ آج شہر گئے ہوئے تھے۔ دونوں نے شام تک بیٹھ کر حویلی میں شراب پی اور رات گئے موٹرسائیکل پر ایک ، اَور ہم مشرب رمیش کو بٹھا کر واپس آئے۔ موٹرسائیکل ایکھ کے کھیت میں چھپا دی۔ جاڑا بہت تیز تھا اور کہرا بھی تھا۔ جگہ جگہ گاؤں کا دھواں کہرے میں مل کر گاڑھا ہو کر ہوا میں معلق کچھ کچھ ٹھوس ہو گیا تھا۔ گاؤں سو چکا تھا۔ لیکن گاؤں کے سونے کا مطلب خاموشی نہیں ہوتا۔ چھپر تلے بندھی بھینسیں ایک دوسرے سے بدن رگڑتی رہتی ہیں، ایستادہ گائیں سوتے سوتے آنکھ کھول کر ڈکرانے لگتی ہیں اور بے خواب کتے ایک دوسرے پر غرا غرا کر بے ضرر جھپٹیں کرتے رہتے ہیں۔

پہلے تو یہ تینوں چپ چاپ گڑھی میں داخل ہوئے۔ چار دیواری کے پاس ہی بیٹھا نیلا جگالی کر رہا تھا۔ دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سینگ آگے کر کے، سر نیچا کر کے پینترے بدلنے لگا۔ اونکار نے

دھیرے سے سیٹی بجا کر، پاس جا کر اسے تھپکی دی۔ دونوں کو اندر لایا۔ پرتاپ بھی شہر گیا ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں اونکار کے دوستوں نے جھانکا۔ ہلکی چاندنی میں کھڑکی کے قتلے ایک جوان عورت کے بدن پر پڑ رہے تھے۔

"یہ کون مال ہے؟" رمیش نے اونکار سے پوچھا۔

"چپ سالے... بھابھی ہے۔"

"ہوہوہوہو..." راکیش اور رمیش بے ڈھنگے پن سے شرمندہ شرمندہ ہنس رہے تھے۔

تینوں نے اونکار کے کمرے میں بیٹھ کر منصوبے کو آخری شکل دی۔ تھوڑی دیر بعد رمیش نیلے سے بچتا ہوا گڑھی کے دروازے سے باہر نکلا اور کمہار کی بیوہ کے جھونپڑے کے پاس پہنچا۔ جھونپڑے میں کمہار کی بیوہ کے چند گدھے بندھے خاموش کھڑے تھے۔ جھونپڑے کے پاس آ کر رمیش نے آواز دی:

"مائی... او مائی...!"

"کو ہے؟" اندر سے آواز آئی اور چاندی کے ہلکے زیور بجنے لگے۔ لڑکیاں بھی اٹھ گئی تھیں۔ تینوں نے ایک ساتھ آ کر بانس کا ٹٹر ہٹایا۔

"میں لکھنا ہوں۔ کھلیل پور سے آیا ہوں۔ تمھارے ہووے والے جمائی پر ڈاکوؤں نے حملہ کروؤ ہے۔ تمھیں بلایو ہے۔"

"ہے ری دیا!" کہہ کر تینوں رونے لگیں۔ بڑی بیٹی نے احتیاط کی کہ آواز زور سے نہ نکلے۔ لکھن نے مشورہ دیا کہ ماں اور چھوٹی بیٹی چلی چلیں۔ بڑی کی سگائی ہو چکی ہے، اس کا اُس گاؤں میں، خاص طور پر اُس گھر میں جانا ٹھیک نہ ہوگا۔

بڑی بیٹی کو اکیلے جھونپڑے میں چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ لکھن نے مشورہ دیا کہ گڑھی میں بڑی بہو کے پاس چھوڑ دیا جائے۔

بڑی بہو نے اندر کا دروازہ کھول کر پہلے تو واقعے پر افسوس کا اظہار کیا، پھر بڑکی کو اپنے کمرے میں بلا کر زمین پر بچھونا دے کر لیٹنے کو کہا۔

کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی لکھن کے ساتھ گاؤں کی حد سے نکل گئے۔

سیاست داں باپ کے بیٹے کا منصوبہ بڑا چست درست تھا۔ لکھن نے گاؤں سے باہر جا کر ان دونوں ماں بیٹی کو گھونسے مار مار کر بے قابو کیا، اور سر درات تلے آموں کے ایک اجاڑ باغ میں، جس کی نشان دہی اونکار نے کر دی تھی، ٹیوب ویل کے کمرے میں رسی سے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر ڈال دیا۔ چلتے چلتے اس کے دل میں رحم آیا اور بہت سا پیال اٹھا کر دونوں پر ڈال دیا۔

لکھن اب دوبارہ رمیش بن چکا تھا۔ اس نے گڑھی کے دروازے کے پاس آ کر آوازیں دیں۔

اونکار اپنے کمرے سے زور سے چلاتا ہوا نکلا: "آتا ہوں... کون؟"

نیلے کی بہترین کار کردگی کی وجہ سے پہرے کے نوکر اپنی مڑھیا میں پیال اوڑھے سو رہے تھے۔

بھابھی نے گھبرا کر کھڑکی پر آ کر پوچھا، "کون ہے اونکار؟"

"دیکھتا ہوں بھابھی۔"

دروازے پر آ کر اس نے دھیمی آواز میں رمیش کی پوری کار کردگی کا احوال سنا اور بھابھی کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر بولا:

"برابر کے گاؤں سے ایک آدمی آیا ہے۔ وہاں پتاجی کے دوست یادو ماساب پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ مجھے بلایا ہے۔"

"جاؤ۔ بندوق لے جانا۔"

تینوں گاؤں سے باہر آ کر کچھ دیر تک ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ بوتل کھول کر ایک ایک گلاس شراب اور پی، اور آخری مرحلے کی طرف بڑھے۔ ان کا رخ گڑھی کی طرف تھا۔

صدر دروازے کے بجائے ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہوئے۔ اونکار چھپا رہا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر آواز دی:

"اونکار! او اونکار بھائی..." بھابھی گھبرائی آنکھیں ملتی ہوئی ساڑھی برابر کرتی ہوئی اٹھی۔ کھڑکی پہ آ کر پوچھا، "کون ہو؟"

"یادو ماساب پر حملہ ہوا ہے۔ اونکار بھائی کو بلایا ہے۔"

"ابھی ابھی تو اونکارو ہیں گئے ہیں۔ گاؤں سے نکلے ہی ہوں گے۔"

"اچھا تو ہم چلتے ہیں۔ آپ کے گھر میں ٹارچ ہو گی؟ بیٹری؟ ہماری ٹارچ راستے میں گر پڑی۔ دگڑے پر بہت پانی ہے۔ موٹر سائیکل پھنس جائے گی..."

"ہوں.... ابھی لاتی ہوں..."

اندر بڑکی جو سب سن رہی تھی بھابھی سے لپٹ گئی۔ "مو بے ڈرلگ رواے۔"

"ڈرومت... کبھی کبھی اچانک چاروں طرف سے مصیبت آ جاتی ہے..." بھابھی نے اسے دلاسا دیا۔ اس نے دروازہ کھول کر ہاتھ بڑھا کر ٹارچ دینا چاہی۔ رمیش نے بھابھی کے ہاتھ کے بجائے کندھے کو پکڑ کر جھٹکے سے کھینچا اور اس سے پہلے کہ وہ چیخ سکے، منہ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر اندر داخل ہو کر پلنگ پر گرا کر بے قابو کر لیا۔ بھابھی پلنگ پر ٹانگیں مارتی رہی۔ بڑکی منہ پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہی تھی کہ راکیش نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ارہر کے جوان پودوں کے گٹھے کی طرح باندھ کر ڈال دیا۔ بھابھی مضبوط بدن والی نئی عمر کی عورت تھی۔ ابھی پچھلے ہی سال شادی ہوئی تھی۔ اسے قابو میں کرنے میں زیادہ وقت لگا کیوں کہ ایک ہاتھ سے منہ دبائے رکھنا بھی ضروری تھا... اس درمیان اونکار اندھیرے میں کھڑے نیلے کو تھپکیاں دیتا رہا۔ رمیش نے بھابھی کو باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ رمیش کی سانس بھی اکھڑ گئی تھی۔ کچھ تو طاقت آزمانے کی وجہ سے اور کچھ بھابھی کے گرم گداز بدن کو دیر تک جکڑے رہنے کی وجہ سے۔ راکیش نے بڑکی کو کندھے پر اناج کی بوری کی طرح ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ بھابھی بھی آنکھیں پھاڑے سارا منظر دیکھتی رہی۔

لالٹین بجھ گئی تھی۔ چاندنی جالی دار کھڑکی سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ بھابھی نے دیکھا کہ اسے بے قابو کرنے والا ابھی تک کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا ہے اور ہولے ہولے ہانپ رہا ہے۔ وہ پیش آنے والے واقعے سے بے چین ہو کر بندھے بندھے تڑپنے لگی۔ اس کی ساڑھی گھٹنوں سے اوپر سرک آئی تھی اور مدھم چاندنی میں اس کی پنڈلیاں دیوالی کی موٹی موٹی موم بتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہانپنے کی وجہ سے سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ رمیش نے کھڑے کھڑے کچھ سوچا۔ کھڑکی سے جھانک کر راکیش سرگوشی میں باہر سے چلّایا، "ابے جلدی کر... کیا کر رہا ہے؟"

"آ رہا ہوں بے!" یہ کہہ کر اس نے یاد کیا کہ دو تین گھنٹے پہلے ہی اس نے اس بندھی ہوئی عورت کو "مال" کہا تھا... وہ اس پر جھکا اور اسے چھٹپٹاتا دیکھتا رہا۔ کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا جس نے نشے کو کچھ ہلکا کیا۔

وہ واپسی کے لیے مڑا... پھر کچھ سوچ کر پلٹا اور یہ سوچ کر کہ یہ عورت اس کے بدمعاشیوں کے یار اونکار کی بھابھی ہے، اس نے ہاتھ بڑھا کر ساڑی پیروں تک سرکا دی اور نشے کے عالم میں بھی اس بات کا پورا خیال رکھا کہ ساڑی نیچے سرکاتے وقت اس کا ہاتھ گھٹنوں سے پیروں تک مسلسل عورت کے بدن سے رگڑتا ہوا نیچے تک آ سکے۔ اسی انداز سے اس نے اوپر کا پلو بھی سینے پر برابر کیا۔ دروازے سے نکل کر وہ مسکرایا کہ پورا مال نہ سہی کچھ اٹھنیاں چونیاں تو بین ہی لیں۔

رات بہت اندھیری تھی۔ باہر نکل کر تینوں کمہار کے گھر تک آئے اور اونکار بڑکی کو لے کر اس کے جھونپڑے میں گھس گیا اور دونوں باہر اندھیرے میں چھپ کر پہرہ دیتے رہے۔ رمیش دھیمی دھیمی آواز میں راکیش کو اپنی تازہ فتوحات کا واقعہ سناتا رہا جسے سن کر راکیش "دھت دھت" کرتا رہا۔ لیکن جیسے ہی رمیش خاموش ہوتا، راکیش اس کا چہرہ دیکھنے لگتا۔ "پھر کیا ہوا؟"

اونکار نے زمین پر پڑے پیال پر بڑکی کو ڈال دیا اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اپنے سر سے مڑاسا کھول لیا۔ اندر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ماچس جلا کر لونڈیا کا بدن غور سے دیکھا۔ اسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ دور سے یہ جتنی جاندار نظر آتی تھی اتنی تگڑی نہیں تھی۔ اس نے ماچس دوبارہ جلائی اور اس کے سانولے پیروں اور اُجلے تلووں کو دیکھا۔ پاؤں سانولے تھے اور تلوے اُجلے تھے، لیکن ایڑیوں میں مٹی اور پانی کے مسلسل برتاؤ کی وجہ سے دراریں سی پڑ گئی تھیں۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں رانیں ٹٹولیں۔ وہ اتنی سخت نہیں تھیں جتنی وہ سمجھ رہا تھا۔ بڑکی رانوں پر ہاتھ لگنے کی وجہ سے بھڑکنے لگی۔ آنکھوں پر پٹی اور منہ میں کپڑا ہونے کی وجہ سے چہرے کی ہئیت عجیب سی ہو گئی تھی، لیکن اتنی بدہئیت نہیں کہ اونکار کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے... وہ بدن پر ہاتھ پڑتے ہی مچھلی کی طرح تڑپتی تھی۔ اونکار نے معائنے کے آخری مرحلے کے طور پر لونڈیا کی گردن کی جڑ سے نیچے کی طرف ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سینے کے ابھار معمولی تھے... اس کے ہاتھ پیٹرو کے اوپر چٹانما پسلیوں کے ڈھانچے پر آ کر رک گئے۔ وہ ایک ایک پسلی کو انگلی سے

چھو چھو کر محسوس کرتا رہا اور لونڈیا کے دبلے پن پر افسوس کرتا رہا۔ بڑکی کا بدن گرم تھا اور سانسیں تیز تھیں اس لیے اونکار بالکل بیزار نہیں ہو پایا لیکن اتنی محنت، منصوبوں اور جوکھم کے بعد ملنے والے انعام کو اس نے اپنے حق سے کچھ نہیں بلکہ خاصا کم محسوس کیا۔ وہ بڑکی سے اس کا بدلہ لینے لگا اور بہت دیر تک اپنے حساب نت نئے طریقوں سے اسے برتتا رہا۔

چھپر کا ٹٹر لگا کر وہ تینوں کھیتوں تک آئے جہاں ایکھ میں موٹر سائیکل چھپا کر رکھی تھی۔ اونکار نے راکیش اور رمیش کو رخصت کیا اور اندازہ کرنے لگا کہ اپنے گاؤں سے ماساب کے گاؤں جانے اور وہاں سے آنے میں زیادہ سے زیادہ کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ اتنا ہی وقت گزار کر وہ گڑھی پہنچنا چاہتا تھا جہاں بھابھی بندھی ہوئی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

گڑھی میں آکر بھابھی کے کمرے میں پہنچ کر بھابھی کو اس حالت میں دیکھ کر اس نے وہ ساری حرکات کیں جو ایسے موقع پر اسے کرنا چاہیے تھیں۔

بھابھی منھ کا کپڑا نکلتے ہی رونے لگی۔ جب اس نے پوری بات بتا کر بھی رونا جاری رکھا تو اونکار کو شک ہوا کہ رمیش نے بھابھی کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ہے۔ بھابھی کی گردن کے نیچے اسے نیل کا نشان نظر آیا۔ اس کا سارا نشہ اتر گیا۔ پھر اس نے کرید کرید کر ڈاکوؤں کی حرکتوں کے بارے میں پوچھا۔ بھابھی اسے بڑی مشکل سے یقین دلا پائی کہ اس کی عزت پر آنچ نہیں آ پائی۔

اونکار نے بھابھی کو بتایا کہ یہ سب منصوبہ بند سازش تھی۔ "یادو ماساب پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی وہ آدمی راستے میں کسی کام کا بہانہ کر کے دوسرے راستے پر ہو لیا تھا۔ میں بھی ان کے گاؤں تک نہیں گیا تھا، گاؤں کے باہر ہی ماساب کی خیریت مل گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی اور چکر ہے۔ وہیں سے بھاگا بھاگا آ رہا ہوں۔"

اونکار نے محسوس کیا کہ وہ اگر چاہے تو جاسوسی اپنیاس لکھ سکتا ہے۔ لیکن بھابھی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"وہ لوگ بڑکی کو بھی اٹھا لے گئے۔ سامنے والی لڑکی کو۔"

"آخر وہ کون لوگ تھے اور انھوں نے ایسی ہمت کیوں کی؟ گھر میں چوری بھی نہیں ہوئی...

کچھ سمجھ میں نہیں آتا..." اونکار نے سر پر ہاتھ رکھ کر بھابھی کے سامنے نوٹنکی کی۔

صبح سب سے پہلے کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی گاؤں میں داخل ہوئی جنھیں رگھوبیر باغ والے نے ٹیوب ویل کے کمرے سے آزاد کیا تھا۔ ان دونوں نے آکر بڑکی کو جھونپڑے میں پا کر اوپروالے کا شکر ادا کیا۔

بھابھی نے تینوں کو بلا کر پوچھا، "یہ سب کیا چکر تھا؟" تینوں آنکھیں پھاڑے بھابھی کو دیکھتی رہیں۔

نو بجے تک پولیس رپورٹ کر دی گئی۔ رپورٹ اونکار نے کی تھی کہ بڑکی کے ہونے والے پتی کے کچھ دوستوں نے یہ سب حرکت کی ہے تاکہ اس کا پتی شادی سے پہلے ہی اس کا استعمال کر سکے۔ واقعات کے تانے بانے اس طرح بٹھائے گئے کہ کیس خاصا جان دار لگنے لگا۔ کم ازکم چوکی کے دیوان کا تو یہی خیال تھا۔ اونکار نے موٹرسائیکل کی چوری کی رپورٹ بھی لکھائی۔ موٹرسائیکل رمیش اور راکیش کی مدد سے پھر ایک گنے کے کھیت میں چھپائی گئی جو تیسرے دن سویرے برآمد ہو گئی۔ بڑکی کا میڈیکل ہوا جس میں طرح طرح کی ایذارسانی کے بعد عصمت دری ثابت ہوئی۔ کمہار کی چھوٹی بیٹی کا بھی میڈیکل ہوا، لیکن اس کی رپورٹ ٹھیک آئی جس پر گاؤں والوں نے ڈاکٹروں کی ملی بھگت کا الزام لگایا...

بڑکی کا ہونے والا پتی کالج سے آتے وقت گرفتار ہوا۔ حوالات سے ہی اس نے اعلان کر دیا کہ اس کی سگائی اب ٹوٹی سمجھی جائے۔ وہ میڈیکل رپورٹ کے بارے میں سن چکا تھا۔ البتہ وہ چھوٹی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو یہی کہہ کر ڈھارس دی۔ اس کے ماں باپ نے اس کا پیغام کمہار کی بیوہ تک پہنچایا۔

کمہار کی بیوہ کے چھپر کے اندر بڑکی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ برابر میں اس کی بہن چھٹکی انٹرپاس دولہا کے خیال میں مگن، سامنے کھڑے گدھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ماں کچے برتنوں کو احتیاط سے اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے پر جما رہی تھی۔ سامنے گڑھی کے دروازے سے گڑھی کا صحن نظر آرہا تھا جہاں نیلا کھڑا ہوا اپنے کانوں کی نوکوں کو ہوا کی سمت میں ٹیون کر رہا تھا... بڑکی اچانک سوچتے سوچتے ہنسنے لگی۔ اس کی بہن نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔ "کیوں ہنسی بڑکی؟"

"بس ایسے ہی..."

"بتا نا..."

"میں سوچ رہی تھی میری سہاگ رات اپنے ہی گھر میں ہو گئی..."

بڑکی یہ کہہ کر پھر ہنسی۔ چھٹکی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ سامنے جیپ آکر رکی اور نمبردار اودل سنگھ اترے۔ تیر کی طرح سیدھے اندر گئے، کمرے کے باہر کھڑے ہو کر کھڑکی کے راستے بہو سے تسلی کے کچھ جملے کہے، اونکار کو بلا کر حالات کا براہِ راست علم حاصل کیا اور پہرے کے نوکروں کو بلا کر جوتے لگوائے۔ جوتے کھا کر انھوں نے اقرار کیا کہ وہ اس رات اس لیے سو رہے تھے کہ جب سے نیلا بڑا ہوا ہے وہ گڑھی میں چور تو چور پڑوسیوں تک کو نہیں آنے دیتا۔ اسی لیے انھیں کوئی ڈر نہیں تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے کوئی ایسی ہمت کر سکے گا۔

شہر سے قصبے اور قصبے سے دیہات تک آنے میں اودل سنگھ نے صرف اسی بات پر غور کیا تھا کہ علاقے میں کس کی اتنی مجال ہوئی کہ ان کی گڑھی میں داخل ہو کر ان کی بہو کو باندھ کر پناہ لینے والی لڑکی کو اٹھا لے جائے۔ اس بات پر انھوں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی انھوں نے خود کو اندر سے بہت کمزور محسوس کیا۔ کیا نیلا چوکی داری کے کام میں نکما ہو گیا؟ کیا واقعی یہ نکما ہو گیا؟ انھوں نے باہر آکر نیلے کے پاس کھڑے ہو کر اسے بغور دیکھا۔ وہ ان کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ آج اودل سنگھ کو اس پر پیار نہیں آیا۔ اس کی زبان کے کانٹے ان کے ہاتھ میں چبھے۔ انھوں نے اس کا منھ پکڑ کر ایک طرف کر دیا اور اندر آکر دالان میں خاموش لیٹ گئے۔

اس کا مطلب، اب کوئی بھی گڑھی یا حویلی میں داخل ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے؟ اس کا مطلب، میں اب پھر گڑھی اور حویلی کی حفاظت کی پابندی میں پھنس جاؤں گا؟ اس کا مطلب، اس نیلے کو پالنا بے کار گیا؟

اونکار باپ کو خاموش دیکھ کر ان کے پاس آ گیا اور مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

"یہ کام کمہار کے جمائی کا نہیں ہو سکتا،" انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اونکار سمجھا باپ سوال کر رہا ہے۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا، "پتاجی، ہو نہ ہو اس کے کسی

ناتے دار کا کام ہے۔ وہاں اتنی رات کو کمہار کے گھر آ کر کوئی انت جگہ کا آدمی ایسی ہمت نہیں کر سکتا..."

"تم نے رپورٹ کیوں لکھائی؟ میرے آنے کی راہ تو دیکھتے۔"

اونکار چپ رہا۔

"رپورٹ سے بدنامی بھی تو ہوئی۔"

"بدنامی تو نہیں... بھابھی کو کسی نے کچھ... مطلب غنڈوں نے کچھ نہیں کیا..." حالاں کہ وہ اس کی گردن کے نیچے ایک موٹا سا نیل کا نشان دیکھ چکا تھا۔

"بہو کی بات نہیں، گدھے! اصل بات یہ ہے کہ لوگ اب گڑھی میں گھسنے سے ڈریں گے نہیں... میں ہوتا تو نہ رپورٹ ہوتی نہ بڑکی کا رشتہ ٹوٹتا..."

"پھر غنڈوں کا پتا کیسے چلتا؟"

"اب چل گیا کیا؟" انھوں نے غرّا کر پوچھا۔ تھوڑی دیر بعد اونکار اٹھ گیا۔ اودل سنگھ بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہے۔ اچھی خاصی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ بہو نے رضائی لا کر پائنتی رکھ دی تھی مگر انھوں نے اوڑھی نہیں۔

باہر آ کر دیکھا تو نیلا زمین پر بیٹھا، بھوسے کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ رہا تھا۔ انھیں نیلے سے اچانک بیزاری سی محسوس ہوئی۔

گڑھی کے دروازے میں بڑکی داخل ہوئی اور سیدھی بہو کے پاس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد بہو گھونگھٹ کاڑھ کر بڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس آئی۔ "یہ کہتی ہے کہ جس آدمی نے اس کی ماں کو جھوٹے حادثے کی خبر دی تھی وہی آدمی گڑھی میں بھی آیا تھا۔ یہ اس کو آواز سے پہچانتی ہے اور جب وہ مجھے باندھ رہا تھا تو اس نے اس کی صورت بھی دیکھی تھی..."

"کیا اسی نے اس کی عزت لوٹی؟"

"نہیں... وہ کوئی اَور تھا..." بہو نے دھیرے سے جواب دیا۔

"اس کا قد کاٹھ؟"

بڑکی نے نظر نیچے کر کے اس آدمی کا حلیہ بتایا اور بتایا کہ اس کے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان

تھے۔ بھو نے بھی سر ہلا کر اس کی تصدیق کی۔

"تُو نے اُس آدمی کو بھی دیکھا جس نے تیرے ساتھ چھیڑخانی کی تھی؟" اودل سنگھ نے گاؤں کی لڑکی سے ذرا نرم الفاظ استعمال کیے۔

"نہیں بابوجی... میری آنکھوں پر پٹی تھی..." وہ آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔ بھو اسے لے کر اپنے کوٹھے میں چلی گئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ انھیں رہ رہ کر نیلے کے نکمے پن پر تاؤ آ رہا تھا۔

شام کو سورج ڈوبنے کے بعد وہ قصبے کی طرف چلے گئے۔ حویلی میں بھی انھیں ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی انھوں نے تھانے دار صاحب کو ناشتے پر بلایا۔ اسے آنے میں دیر ہوئی تو ان سے صبر نہیں ہوسکا۔ املی کے درخت کے نیچے ایک میز اور تین کرسیاں پڑی تھیں۔ تھانے دار نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور پھر ان رجسٹروں کو غور سے پڑھنے لگا جن میں پڑھنے کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی کیوں کہ سارے اندراجات اس نے اپنے ہاتھ سے کیے تھے۔ تھوڑی دیر مصروف رہنے کے بعد اس نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا:

"نمبردار جی، کیا پیو گے؟ چائے یا کافی؟"

"اماں چھوڑیے چائے کافی... آپ ناشتے پر نہیں آئے۔"

تھانے دار نے علاقے کے چوروں، ڈاکوؤں اور غنڈوں کو ماں کی ایک ہی گالی میں باندھتے ہوئے انھیں بتایا کہ پولیس کو کچھ کاغذی کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

انھوں نے رازداری کے انداز میں تھانے دار کو بتایا کہ جو غنڈے گڑھی میں داخل ہوئے تھے ان میں ایک کے ماتھے پر زخموں کے دو نشانات تھے۔ وہ کل ملا کر تین تھے لیکن گڑھی میں صرف دو آئے تھے، حالاں کہ اصل کام تیسرے نے کیا تھا۔

تھانے دار نے کچھ پرانے رجسٹر نکالے۔ بڑے منشی جی کو بلا کر سرگوشیاں کیں۔ ایک دو سپاہیوں کو ہم راز بنایا...

"آپ شام کو تکلیف کرو تو میں ایسے تین چار لوگوں کو حاضر کر سکتا ہوں۔"

شام کو جب وہ دوبارہ تھانے میں آئے تو اس وقت بجلی چلی گئی تھی۔ بڑی بڑی دو لالٹینیں

جل رہی تھیں اور ان لالٹینوں کی روشنی میں تین لونڈے ڈنڈے کھا رہے تھے۔ تھانے دار نے انھیں بتایا کہ "یہ گلفام کنجڑے کا بڑا بھائی ہے جمراتی، یہ رام چندر تیلی کا داماد ہے للو، اور یہ ہے کلو پہلوان کا لونڈا ونود... اب آپ پہچانیے۔"

نمبردار اودل سنگھ شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ تھانے کے پھاٹک پر لونڈوں کے عزیز رشتے دار آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ لوگ قصبے کے مقامی وکیلوں کو لے کر آئے تھے۔ تھانے دار صاحب نے وکیل حضرات کو کرسیاں پیش کیں۔

اتنے میں حویلی سے نوکر نے آ کر اودل سنگھ سے کہا کہ انھیں تُرنت حویلی میں بلایا گیا ہے۔

وہ فوراً جیپ میں بیٹھ کر حویلی پہنچے۔ وہاں بھی بجلی نہیں تھی۔ بڑے پھاٹک میں داخل ہو کر جیسے ہی صحن میں آئے ایک آدمی نے اندھیرے سے نکل کر ان کے پیر پکڑ لیے۔ وہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکے۔

"کون ہے؟ ابے کون ہے؟ کیا بات ہے، کیا میّا مر گئی؟"

"ایسے ہی سمجھو بابوجی... صبح سے پولیس دو دفعہ دوش دے چکی ہے..."

وہ ان کا پیر پکڑے پکڑے دالان تک آیا جہاں لالٹین جل رہی تھی۔ اودل سنگھ بھی ڈیڑھ ٹانگ سے چلتے ہوئے آئے اور لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ جو آدمی ان کے پیر پکڑے ہوئے تھا اس کے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان واضح تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تھانے میں پہنچے اور انھوں نے گلفام کے بڑے بھائی جمراتی کی نشان دہی کی کیوں کہ وہ امرودوں والے واقعے کے بعد اودل سنگھ کے پورے خاندان کا دشمن ہو گیا تھا۔ باقی دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔ جمراتی کے وکیل محمد عمر نے جمراتی کو کونے میں لے جا کر سمجھایا کہ وہ جرم قبول کر لے تاکہ حوالات کی مار سے بچ سکے۔ ضمانت ہو جائے گی۔ پورا معاملہ دو ہزار میں طے ہوا۔

ٹھاکر اودل سنگھ قصبے میں نہیں رکے۔ ان کے چہرے پہ سرخی چھلک آئی تھی جیسے کئی گلاس بھر کے تاڑی پی لی ہو۔ وہ دگڑے پر تیزی سے جیپ چلاتے ہوئے گاؤں پہنچے۔ رات ہو چکی

تھی۔ گڑھی کا دروازہ نوکروں نے کھولا۔ سامنے سے نوکر ہٹے تو ان کے پیچھے نیلا کھڑا تھا۔ اودل سنگھ نوکروں کو گالیاں دیتے ہوئے نیلے سے لپٹ گئے۔ وہ ان کی گردن کو اپنی کانٹوں والی زبان سے چاٹتا رہا جو اس وقت اودل سنگھ کو پھولوں کی پنکھڑی کی طرح نرم لگ رہی تھی۔

اونکار کو جگایا۔ اسے کوٹھے میں بلایا۔ جب اونکار آدھے گھنٹے بعد باہر نکلا تو پہرے کے نوکروں نے اسے قریب سے دیکھا۔ اس کے گال پر انگلیوں کے پانچ نشان بہت واضح تھے۔ مگر وہ چہرے سے خوش اور مطمئن لگ رہا تھا، بلکہ ایک نوکر نے اسے آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے بھی سنا۔ اونکار کے سینے پر ایک ہلکا سا بوجھ تھا جو گال کے ایک چانٹے میں اتر گیا تھا۔

صبح اٹھ کر اودل سنگھ نے آدھ سیر کھوئے کے پھیکے پیڑے بنا بنا کر نیلے کے منہ میں ڈالے اور آدھا سیر سرسوں کا خالص تیل پلایا۔ پیڑے کھا کر اور تیل پی کر وہ اُچھلنے لگا اور پھر چلا تو ایسے چلا کہ عام طور پر نیلے اس طرح نہیں چلتے۔

گاؤں کے پرائمری پاٹھ شالا کے بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے، جو باقی تین ماسٹروں کا کام بھی خود دیکھتے تھے، اس بات پر حیرت کی کہ نیلا کھویا کھاتا ہے اور سرسوں کا تیل پیتا ہے۔

"اس پرکار کی کھاد سے جنگل کا جانور اندر سے بگڑ جاتا ہے..."

ٹھاکر اودل سنگھ نے ان کی بات سنی ان سنی کر کے جیپ اسٹارٹ کی اور ڈیزل کا دھواں ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر دیر تک ناچتا رہا۔

❖

نیلا اب اور زیادہ تگڑا ہو گیا تھا۔ پورا دھڑ سیاہ ہو چکا تھا اور سینگ موٹے ہو گئے تھے۔ اب وہ آزادی کے ساتھ بغیر کسی کی مدد کے گاؤں سے قصبے اور قصبے سے گاؤں تک آپ ہی آپ چلا جاتا تھا۔ راستے میں فصل کے اندر سے ہو کر آنے میں اسے خاص لطف ملتا تھا۔ فصل بڑی ہو تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا تھا لیکن اگر چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے تو نیلے کے کھُروں کی پوری پگ ڈنڈی بن جاتی

اور اس حصّے کی فصل بُری طرح ماری جاتی۔

کسانوں نے ایک آدھ بار دبی زبان سے شکایت کی۔ اودل سنگھ ان کی تالیف قلب کے لیے کہہ دیتے کہ میں اسے سمجھا دوں گا۔ جس وقت وہ یہ کہتے انھیں احساس نہ ہوتا کہ وہ ایک جانور کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ جو لوگ یہ سنتے انھیں بھی احساس نہ ہوتا کہ یہ بات ایک جانور کے بارے میں کہی جا رہی ہے۔

دیوالی انھوں نے اپنے خاندان کے ساتھ شہر میں منائی۔ دیوالی کے دوسرے دن رات کو وہ سب اپنی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ ہلکا ہلکا جاڑا تھا لیکن بالکل اندھیری تھی۔ آسمان پر چھوٹے چھوٹے مدھم تارے چمک رہے تھے۔ کوٹھی کے گیٹ پر کچھ آہٹ ہوئی۔ نوکر نے پاس جا کر دیکھا اور پوچھا:

"کون؟ ... کون ہے؟"

باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا ہو۔ نوکر ڈر گیا۔ بھاگ کر اندر آیا۔ ہانپتے ہوئے بولا، "باہر کوئی ہے... آواز کا جواب نہیں دے رہا ہے..."

سب کے چہروں پر ہلکا ہلکا ہراس پھیل گیا۔ اودل سنگھ اپنے دونوں بیٹوں، بندوقوں اور ٹارچوں کے ساتھ گیٹ پر آئے۔ بندوق کندھے پر رکھ کر گیٹ کھلوایا۔ اندھیرے میں کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ ٹارچ جلائی۔ گھنے اندھیرے میں ٹارچ کی مریل روشنی کا دائرہ اس پر پڑا جس کا رنگ سیاہ تھا اور جس کے سینگ موٹے تھے۔

"ارے!" سب کو بے حد حیرت ہوئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ نیلے کو شہر کا راستہ تو بتایا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ اپنے آپ کیسے آ گیا؟ پھر بھی انھیں دل ہی دل میں بہت خوشی محسوس ہوئی جیسے نیلے کا یہ کارنامہ ان کی ذاتی کارکردگی ہو۔

"اس کا اس طرح آنا ٹھیک نہیں ہے،" پرتاپ بولا۔ "شہر میں نقصان کرے گا تو مشکل ہو جائے گی..."

"کوئی بات نہیں، اسے سمجھا دیں گے،" اودل سنگھ خوشی سے بولے۔

اونکار نے بھی نیلے کی پیٹھ تھپتھپائی۔

رات بھر نیلالان کے پھولوں کو کھوندتا رہا اور منی پلانٹ کی بیلوں کو کھاتا رہا۔

صبح سب سے پہلے مالی نے یہ نقشہ دیکھا اور زور زور سے نیلے کو گالیاں دینے لگا۔ اودل سنگھ آنکھیں ملتے باہر آئے اور پھولوں اور بیلوں کا حشر اور مالی کو غصے میں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اونکار بھی ان کے پیچھے کھڑا ہنس رہا تھا۔ بڑکی کے واقعے بعد وہ باپ کی زیادہ چمچہ گیری کرنے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے نیلا قصبے لایا گیا اور پھر قصبے سے دیہات پہنچایا گیا۔

ہیڈ ماساب نے جب یہ واقعہ سنا تو انھوں نے بتایا کہ "جب پراکرتی کے خلاف کھان پان ہوتا ہے تو جیوجیوں کی آکرتی بگڑ جاتی ہے اور کچھ ایسی شکتیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو جانور میں پیدائشی طور نہیں ہوتیں..."

معلوم نہیں یہ بات کہاں تک صحیح تھی، لیکن اتنا ضرور تھا کہ نیلے سے اب مویشی بھی ڈرنے لگے تھے۔ سانی کھاتے بیل اسے دیکھ کر رسیاں تڑانے لگتے اور تھان پر بندھے گھوڑے اسے پاس آتا دیکھ کر بجائے اس کے کہ اگلے پیر اٹھا کر حملہ کریں، پچھلے پیر اٹھا اٹھا کر کودنے لگتے تھے۔ گڑھی کے سامنے بندھے کمہار کے گدھے تو اسے دیکھتے ہی ایک دوسرے کے پیٹ کے نیچے گھسنے لگتے تھے۔ وہ ان سب سے بے نیاز، اینڈتا برتا، اپنے راستے چلتا رہتا۔ اپنے راستے چلنے سے مراد یہ کہ پڑوس کے گھروں میں گھس کر برتن بھانڈے توڑتا، پاٹھ شالا میں جا کر ہیڈ ماساب کی کرسی اُلٹ دیتا اور ننھے ننھے بچوں کو سینگوں سے ریلتا دھکیلتا رہتا... وہ اب تک آٹھ بچوں کو زخمی کر چکا تھا۔ ٹھاکر نے ان بچوں کے والدین کو بھری پنچایت میں سمجھایا کہ یہی آٹھ بچے نیلے کو پتھر مار مار کر پریشان کرتے ہیں، ورنہ ڈیڑھ سو بچوں میں صرف انھیں آٹھ کو کیوں پسند کرتا؟ باقی بچوں کے والدین نے اپنے اپنے نیک بچوں کا خیال کر کے اطمینان کا سانس لیا اور ان آٹھ بچوں کے والدین کو دیر تک سمجھاتے رہے کہ بے زبان پشو کو چھیڑنا کتنی بری بات ہے۔

نیلے نے ایک دن صبح ہی صبح ہرا چارا کھا کر سرسوں کا تیل پیا۔ ٹھاکر نے آج اسے مونگ پھلی کے دانے بھی دو مٹھی بھر کے کھلائے۔ نیلا اچھلتا ہوا گڑھی کے دروازے کے باہر گیا۔ تھوڑی دیر میں شور اٹھا کہ نیلے نے کھیتوں میں گیہوں کی نرائی کرتی بھیکو کی جوان بہو کی آنتیں ایک ہی ٹکر

میں باہر نکال دی ہیں۔ ٹھاکر جیپ میں بھیکو کی بہو کو ڈال کر فوراً شہر کے اسپتال پہنچے۔ آپریشن کرا کے دو ہفتے بعد جب گاؤں لائے تو گاؤں والوں نے تیسرے دن پنچایت کا نیوتا دیا۔

اودل سنگھ بھی پنچایت میں موجود تھے۔ پچھلے دو دنوں سے وہ گاؤں کے واحد مندر کے پجاری کے پاس رات کو دیر تک بیٹھے رہے تھے۔

پنچایت میں پنچوں کے پاس ٹھاکر بھی کرسی پر جمے بیٹھے رہے، لیکن انھوں نے سر جھکا رکھا تھا۔ بھیکو کے لونڈے نے بڑی تیز آواز میں نیلے کی شکایت کی تھی اور پنچوں سے کہا تھا کہ اسے جنگل میں چھوڑنے کا تُرنت پربندھ کیا جائے۔

اودل سنگھ کچھ دنوں سے محسوس کر رہے تھے کہ کچھ برادریاں ان سے خاص طور پر بہت جلنے لگی ہیں۔ بھیکو کی برداری بھی ان میں سے ہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ چپ رہے۔ مندر کے پجاری بھی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھ کر پنچوں نے اور کئی لوگوں نے کھڑے ہو کر ڈنڈوت کی اور پجاری جی کو برگد کے گھیرے میں بڑے مونڈھے پر بٹھایا۔

سرپنچ ادھیکاری لال کو اودل سنگھ نے ہی سرپنچ بنوایا تھا۔ وہ اس وقت بڑے شش و پنج میں تھا۔ فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے پنچوں سے کچھ مشورہ کیا۔ پھر تھوڑی شرمندگی اور کھسیاہٹ کے ساتھ اس نے اودل سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "نمبردار، آپ تو جانتے ہی ہیں ہم سب لوگ آپ کے جانور سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ پر اب اس کا کچھ پربندھ کرنا آپ بھی ضروری سمجھتے ہوں گے، کیوں کہ پچھلے مہینے اس نے اسکول کے آٹھ بچے زخمی کیے اور بھیکو کی بہو کا پیٹ پھاڑ دیا ... آپ اس بارے میں کیا وچار رکھتے ہیں؟"

وہ اگھن کا آسمان تھا اور اگھن کا آسمان نیلا ہوتا ہے۔ وہ ایسا موسم تھا کہ جاڑا تیز ہونا شروع ہو جاتا ہے، اس لیے اس موسم میں جاڑا تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ سب بڑے برگد کے نیچے بیٹھے تھے کیوں کہ اتنی بڑی پنچایت کے لیے گھر چھوٹا پڑتا تھا۔ برگد پر بہت سے پرندے بیٹھے تھے اور بہت شور مچا رہے تھے کیوں کہ پرندے برگد پر بہت شور مچاتے ہیں۔ ٹھاکر خاموش تھے، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ کبھی کبھی خاموش رہنا بولنے سے زیادہ جچتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے، کیوں کہ اس پوز کے بھی کچھ خاص فائدے ہیں۔ اس وقت اچانک پنچوں نے بولنا بند کر

دیا... سارے میں سناٹا چھا گیا...

جب اودل سنگھ نے محسوس کر لیا کہ اب سناٹا اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ ایک دھیما سا بول بھی اسے کتر کے پھینک دے تو انھوں نے مضبوط اور دکھی لہجے میں فیصلہ کن انداز میں کہا:

"میں تو صرف پشو کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ پر آپ لوگ اگر آدیش دو تو میں اسے ابھی ابھی گولی مار دوں... " وہ رک کر بڑی زور سے چلائے، "رام دین! بندوق اٹھا کر لا... ایل جی کے چار کارتوس بھی... " پوری پنچایت کانپ اٹھی۔ پنچوں کے سر اپنی اپنی گود میں چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ سناٹا پھر چھا جائے، ایک کڑک دار آواز ابھری:

"کیا بکتا ہے مورکھ! گئو بدھ کا شراپ گاؤں پر ڈالے گا؟"

یہ پجاری کی آواز تھی جو مونڈھے سے کھڑے ہو کر غصے سے کانپ رہے تھے۔ انھوں نے سرتیوں سے ثابت کیا کہ نیلا بھی دراصل گئوماتا کے خاندان کا جانور ہے۔ اس کی ٹانگیں، اس کے کھر، اس کے سینگ، سب ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے گائے کے... انھوں نے بتایا کہ اگر گئو بدھ ہوا تو گاؤں میں پہلے تو ہیضے کی وبا آئے گی جو خاص طور سے گود کے بچوں کو چن چن کر لے جائے گی۔ (ماؤں نے ننھے ننھے بچوں کو سینے سے لپٹا لیا۔) پھر تیز موسلادھار بارش ہوگی اور کھیتوں کے پودے جڑ سمیت نکل کر اس سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ (مردوں نے اچک اچک کر اپنے کھیتوں کی اور دیکھا۔) پھر آندھیاں آئیں گی اور درخت یعنی برگد جیسے بڑے ورکش بھی اپنی جٹاؤں کو سمیٹ کر دھرتی سے نکل کر زمین پر بچھ جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے سہمے سہمے انداز سے برگد کے درخت کی طرف دیکھا۔) پھر رات کو بے تال آئیں گے اور گئو بدھ کرانے والوں کے گلے میں دانت گاڑ کر سارا رکت پی جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر ہاتھوں کو دیکھا۔ خون کا نشان نہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔) "اب بولو... کون کرائے گا گئو بدھ؟ اودل سنگھ! آخر تو سارے گاؤں پر یہ آفت کیوں ڈالنا چاہتا ہے؟ بول!"

نمبردار اودل سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی۔ "مہاراج! میں پنچوں کے آدیش کا سیوک ہوں۔ میں گاؤں بھر کی بات سے الگ نہیں جا سکتا۔"

مہاراج، جو اب تک مجمعے کو پڑھ چکے تھے، چیخ کر بولے:

"گاؤں میں کون ہے جو نیلے کو مارنے کی بات کہہ رہا ہے؟"

سناٹا چھا گیا۔

"مارنے کی بات نہیں، مہاراج جی... ہم کہتے ہیں کہ اسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے..." بھیکو کا لونڈا کھڑا ہو کر کنمنایا۔

"جنگل میں چھوڑ دیا جائے؟ یہاں جنگل کہاں ہیں؟ میدان ہی میدان ہیں۔ اگر کسی مُسلے نے پلے پلائے نیلے کو گولی مار دی تو بدھ کی ذمےداری گاؤں پر سے ہٹ جائے گی کیا؟ بولو... جواب دو!"

ٹھاکر اودل سنگھ سر جھکائے حساب لگاتے رہے کہ پجاری جی نہ صرف یہ کہ مشورے کے مطابق خیالات دہرا رہے ہیں بلکہ تقریباً انھیں الفاظ میں جن کی ریہرسل پچھلی دوراتوں سے ہو رہی تھی۔

"میدان میں کتنے جنگلی نیلے بھاگتے رہتے ہیں، کبھی اس کھیت میں کبھی اس کھیت میں۔ کبھی اس کا گیہوں چکھا کبھی اس کی ارہر پر منہ مارا... ان میں سے کسی کو تم نے مارا؟ جواب دو؟"

"للکار تو دیتے ہیں... بھگا تو دیتے ہیں..." بھیکو کا لونڈ آسانی سے ہار نہیں مان رہا تھا، حالاں کہ زور ٹوٹ رہا تھا۔

"تو اسے بھی للکار دیا کرو۔ یہ تو انسانوں میں پلا ہے۔ للکار فوراً سمجھ لے گا..."

نیلا گڑھی کے دروازے سے منہ نکالے پنچایت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ پجاری نے اسے ایک نظر دیکھ کر رام لیلاوالے انداز میں کہا:

"بےزبان پشو نے دور سے منشوں کو دیکھا اور اپنے بارے میں ان کی زبان سے بدھ کی بات سن کر ایشور سے کہا کہ ہے بھگوان! میں کہاں آ پھنسا ہوں؟ ہے بھگوان! میں کہاں آ پھنسا ہوں؟ ہے بھگوان! میں کہاں آ پھنسا ہوں؟"

پوری پنچایت نے کھڑے ہو کر گڑھی کے دروازے سے سر نکالے نیلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس بات کا پورا یقین کیا کہ نیلے نے ابھی ابھی آسمان کی طرف دیکھ کر ایشور سے یہی بات کہی ہے۔ سب کے من بھاری ہو گئے اور سر لٹک کر سینے پر آ گئے۔

اودل سنگھ نے دل ہی دل میں پجاری کو داد دی کہ یہ آخری ٹکڑا مشورے کے مطابق نہ ہونے کے باوجود بڑا اثردار تھا۔

پنچوں نے تھوڑی دیر بعد اپنا فیصلہ سنایا۔

"سبھی لوگوں سے بنتی ہے کہ نیل گائے کو کچھ نہ کچھ کھلاتے رہنا چاہیے۔ جب بھی وہ ان کے پاس سے گزرے تو اسے کچھ کھانے کو دے دیں۔ اگر وہ سینگ سامنے کر کے آئے تو اسے للکار کر ایک طرف ہٹ جائیں... گئو بدھ کے بارے میں کوئی بات دھیان میں نہ لائیں۔ اس سے شراپ لگتا ہے..."

پنچایت جب چھٹی تو سبھی لوگ اودل سنگھ کے شکر گزار تھے جنھوں نے آج نیلے کو گولی نہ مار کر سارے گاؤں کو مختلف آفتوں سے بچا لیا تھا۔ ٹھاکر سر جھکائے سب کا دھنیہ واد خاکساری کے انداز میں قبول کرتے رہے۔ بھیکو کا لونڈا جب پنچایت سے اٹھا تو اس کا دل مطمئن نہیں تھا، مگر وہ بے بس تھا۔ اسے لگا جیسے اندر ہی اندر کوئی نم لکیر دماغ سے آنکھوں تک کھنچ گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چلا جہاں اس کی بیوی پیٹ پر پٹیاں باندھے چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر گردن موڑ کر اسے دیکھنا چاہا تو پیٹ کے ٹانکوں میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کا سر دھم سے چارپائی پر آ رہا اور وہ ہولے ہولے سسک کر کانپنے لگی۔ مگر اس حالت میں بھی اس نے محسوس کیا کہ اس کے پتی کی چال سے ایسا لگ رہا ہے جیسے پنچایت سے واپسی پر خلیفہ حجام نے اس کے پتی کو کسی چھپر تلے گرا کر بدھیا کر دیا ہو۔

❖

نیلے کی قصبے والی واردات زیادہ گمبھیر تھی۔

اس واردات کا تعلق بھی دیہات سے ہی تھا، بلکہ شاید جنگل سے تھا... یا ممکن ہے دونوں سے ہو۔ ایک دن جب سورج کچھ اوپر چڑھ آیا تھا اور ہوا میں گرمی آ چکی تھی تو نیلے نے گڑھی سے نکل کر کھیتوں کا رخ کیا۔ کھیت ویران پڑے تھے۔ گیہوں کاٹ کر دائیں چلا کر اور تھریشر کی مدد

سے بوروں میں بند ہو کر کھلیانوں میں آ چکا تھا۔ کھیتوں کے پاس پہنچ کر نیلے نے زمین پر منھ مارا۔ گیہوں کے سوکھے پودے جو اِدھراُدھر پڑے رہ گئے تھے بہت بے مزہ محسوس ہوئے۔ اس نے بیزاری کے ساتھ سامنے میدان کی طرف دیکھا۔ سامنے اس کے ہم جنس کھڑے تھے۔ اس نے انھیں پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ، دو موسم پہلے، وہ دو تین گھنٹوں کے لیے ان میں رہ بھی آیا تھا، لیکن ان کی وحشت کا ساتھ نہیں دے پایا تھا۔ داڑھی والے سیاہ نیلے نے اسے دیکھ کر سینگ آگے کر کے پینترا بھی بدلا تھا، مگر وہ اس سے محفوظ فاصلے پر کھڑا رہا تھا۔ بھوری ماداؤں نے اسے پہلے حیرت، پھر خوشی، پھر شوق کی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے بھی ان میں کشش محسوس کی تھی۔ اچانک پیچھے سے کھیت والوں نے چلاچلا کر روندنا شروع کر دیا تھا۔ داڑھی والا سیاہ نیلا زمین پر اچھلا تھا اور ماداؤں کے پیچھے تیزی سے دوڑنے لگا تھا جو اس سے بھی پہلے کان بلا بلا کر اور دُم گھما گھما کر خطرے کا اعلان کر کے بھاگ چکی تھیں۔ نیلا اضطراری طور پر ان کے پیچھے بھاگا تھا۔ وہ پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا مگر ان کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اسے اتنا دوڑنے کی عادت بھی نہیں تھی۔ دراصل اسے دوڑنے کی ہی عادت نہیں رہ گئی تھی۔ دوڑنے کی عادت ختم ہو جائے تو بدن کی چربی جلتی نہیں، گانٹھ بن کر رگ پٹھوں میں سما جاتی ہے، اور بھاگنا تو ایک طرف چلنے میں بھی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اتنی باریکیاں وہ شاید نہیں سمجھ پایا تھا لیکن اتنا وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ ان بھوری، دبلی اور چلبلی ماداؤں اور سیاہ داڑھی والے کے ساتھ ساتھ دوڑنا اس کے بس کی بات نہیں... وہ ایک کھیت میں اچانک رک گیا۔ دوڑتے ہوئے لونڈے اس کے پاس جا کر اسے پہچان کر اپنے ساتھ گڑھی میں لے آئے جہاں اودل سنگھ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اودل سنگھ نے اسے گڑ کھلایا اور سرسوں کا تیل پلایا، تب گانٹھوں کا درد کم ہوا۔ اس دن کے بعد سے اس نے متعدد بار اپنے ہم جنسوں کو دیکھا لیکن کبھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ ان کے پیچھے بھاگے۔ البتہ دل چاہتا تھا کہ دو تین بھوری مادائیں اس کے ساتھ بھی گڑھی اور حویلی میں ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔

آج وہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ داڑھی والا کالا اور مادائیں اس کی طرف منھ کر کے ساکت کھڑے تھے۔ وہ گڑھی اور دیہات سے بہت دور، کھیتوں کو پار کر کے میدانوں میں آ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ غیر ارادی طور پر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ان سے تین چار کھیت دور تھا کہ

اچانک رک گیا۔ ان ہم جنسوں کے پیچھے کوئی آدمی ہاتھ میں ایک لمبی چیز اٹھائے چپکے چپکے ٹیوب ویل کی گول میں چھپتا چھپتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ نیلا چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمیوں کے درمیان پلا تھا، اسے آدمیوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مادائیں ایک ایک قدم کر کے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کالا داڑھی والا سب سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک وہ آدمی سیدھا کھڑا ہوا اور لمبی سی چیز کالے داڑھی والے کی طرف کر کے زوردار دھماکا کیا۔ کالا داڑھی والا، بھوری مادائیں اور خود وہ، سب کے سب زمین سے ایک ایک ہاتھ اوپر اچھلے۔ کالا داڑھی والا وہیں گر پڑا اور اگلی ٹانگوں سے اٹھنے کی کوشش کی کہ ایک اور دھماکا ہوا اور وہ زمین پر گردن ڈال کر ڈکرانے لگا۔ بھوری مادائیں کنوتیاں بدل کر دم گھماتی ہوئی تیزی سے بھاگیں اور حد نظر تک دوڑتی چلی گئیں، کھو گئیں... اس نے دیکھا کہ کالی داڑھی والے کے بدن سے لال لال خون نکل کر زمین میں جذب ہو رہا ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہیں اضطراری طور پر زمین پر پیر مارنے لگا۔ دو چار آدمی اس پہلے والے آدمی کے پاس بھاگتے ہوئے آئے اور جیپ لا کر داڑھی والے کو اس میں ڈال کر دھول اڑاتے چلے گئے۔ جس وقت وہ اسے جیپ میں ڈال رہے تھے تو اس کی تھوتھنی اور پچھلی ٹانگیں زمین سے ٹکرا ٹکرا کر گھسٹ رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ڈکرا ڈکرا کر ٹھنڈا ہو رہا تھا... اس کی بے بسی کا یہ منظر دیکھ کر نیلا گھبرا کر پیچھے منہ کر کے جو بھاگا تو گڑھی میں آ کر رکا اور پھر ٹھاکر اودل سنگھ کی چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر خود کو دوبارہ محفوظ خیال کر کے اینڈنے لگا۔

دوسرے دن اودل سنگھ نے اونکار کو بتایا کہ لپٹن کمپنی والے گورے نے کل میدان میں سے ایک نیلا مارا جس پر فیکٹری کے لوگوں نے بہت لے دے کی۔ بڑی مشکل سے پولیس کو دے دلا کر معاملہ ٹالا گیا۔ اس دن کے بعد سے اس نے کبھی جنگل میں ماداؤں کے پاس جانے کی خواہش تک نہیں کی۔ کبھی کبھی کسی وقت وہ کھوئی خواہش اس کے سر سے شروع ہو کر ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی اس کی ٹانگوں کے درمیان پہنچتی تھی تو اسے کالے داڑھی والے کی گھسٹتی ہوئی ٹانگیں اور لتھڑتی ہوئی تھوتھنی یاد آ جاتی... وہ سنسناہٹ ٹانگوں کے بیچ سے ریڑھ کی ہڈی سے گزرتی ہوئی واپس سر میں چلی جاتی۔

ٹھاکر اودل سنگھ، قصبے کی واردات والے دن، محمود صاحب کی بیٹی کی شادی کے نیوتے میں

گئے ہوئے تھے۔ نیلا بھی ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔ محمود صاحب کی حویلی کے پاس میدان میں بڑا سا رنگین شامیانہ لگا تھا اور چاروں طرف موٹریں اور یکے کھڑے تھے۔ شاید پورے قصبے کی دعوت تھی۔ نمبردار جیپ پر تھے اور آہستہ آہستہ چلا رہے تھے کیوں کہ نیلا بھی ان کے ساتھ ساتھ دُلکی میں چل رہا تھا۔ شامیانے کے باہر محمود صاحب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نمبردار نے ہاتھ جوڑ کر مبارک باد دی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے قاضی صاحب نے خطبہ پڑھا کر ایجاب و قبول کرایا۔ دولھا نے اٹھ کر سہرے سے منھ نکال کر سب کو سلام کیا۔ مبارک بادیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھاکر صاحب نے مرغ کا سالن اور دوسروں کو نظر بچا کر بڑے کے کباب کھائے۔ انھیں باراتیوں کے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا تھا حالاں کہ وہ منع کرتے رہے کہ میں تو لڑکی والا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے بٹوے سے ۱۰۵ روپے نکال کر محمود صاحب کو مخاطب کر کے پیش کیے اور ہاتھ جوڑ دیے۔ محمود صاحب نے "اس کی کیا ضرورت تھی!" کہہ کر لفافہ شیروانی کی جیب میں رکھا۔ ایک نوجوان باراتی سہرا پڑھ رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے دیکھا کہ محمود صاحب کا بڑا لڑکا شامیانے کے باہر کھڑے نیلے کو گڑ کھلا رہا تھا۔ وہ اس تواضع سے خوش ہوئے۔ واپسی کی اجازت لے کر وہ رخصت ہوئے۔ نیلا ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ بارات کے بہت سے لوگ بھی نیلے کو دیکھنے کی چاہ میں شامیانے سے باہر آ گئے تھے۔ ٹھاکر صاحب فخر کے ساتھ جیپ میں بیٹھے۔ نیلا دلکی چلنے لگا۔ راستے میں ایک موڑ کاٹ کر انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، نیلا رک گیا تھا اور کانجی ہاؤس کے پاس طویلے میں ایک گائے کو ہری ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور تیزی سے بھاگتا ہوا جیپ سے بھی آگے نکل گیا اور راستے میں ملنے والے ہر خوانچے کو کھدیڑتا، ہر آدمی کو ریلتا، ہر دکان کو سینگوں سے دھکیلتا، حویلی کی طرف بھاگا۔ راستے میں اس نے اڈے کی مسجد سے نکلتے ہوئے بڈھے ملاجی پر کاری وار کیا۔ وہ جا کر سامنے کی پکی دوکان کے چبوترے سے ٹکرائے اور سر کی چوٹ کھا کر وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہونے لگے۔ ٹھاکر تیزی سے حویلی میں آئے اور جیپ کھڑی کر کے دوبارہ وہاں واپس آئے جہاں سینکڑوں آدمیوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کیوں کہ اس دن محمود صاحب کی لڑکی کی شادی تھی اور محمود صاحب ٹھاکر اودل سنگھ کے پرانے مخالف تھے، اور کیوں کہ نیلے کے شکار ہونے والے ملاجی تھے، اور کیوں کہ قصبے میں بہت دن سے کچھ ہوا بھی نہیں تھا، اس لیے معاملہ اتنی جلدی

مذہبی رنگ میں رنگا کہ اودل سنگھ نمبردار کو کسی تیاری کا موقع ہی نہیں ملا۔

محمود صاحب کے باراتی بھی بازار میں آ گئے تھے۔ ان کے سامنے محمود صاحب نے سبکی محسوس کی کہ قصبے میں ان کے ہوتے ہوئے اودل سنگھ کا نیلا ایک مسلمان، وہ بھی مسجد کے موذن، کو یوں مار جائے۔ تھوڑی دیر بعد نعرے لگنا شروع ہو گئے: "جان کا بدلہ جان سے..." "خون کا بدلہ خون سے..." وغیرہ۔ اب اِدھر بھی بھیڑ کی تیاری ہوئی۔ اونکار نے راکیش اور رمیش کو ساتوں محلوں میں دوڑایا۔ بھیڑ چیرتا ہوا، ڈنڈا ہلاتا ہوا تھانے کا انچارج وردی پہنے آیا اور ملاجی کو جیپ میں لدوا کر شہر کے اسپتال بھیج دیا گیا۔ بھیڑ جذبات میں بےقابو ہو رہی تھی۔ تھانےدار نے مشورہ دیا کہ "تھانے چلے چلیے۔ آپ کے لیے اور میرے لیے وہی زیادہ محفوظ جگہ ہے۔" ٹھاکر اودل سنگھ جب تھانے تک بہ حفاظت آ گئے اور تھانےدار کے دائیں طرف والی کرسی پر محمود صاحب کے مقابل بیٹھ گئے تو ان کے ذہن کی بیٹری نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا۔ محمود صاحب کا اصرار تھا کہ فوراً دفعہ ۳۰۲ کی رپورٹ لکھی جائے۔ ٹھاکر خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ کبھی کبھی منھ اٹھا کر تھانے کے پھاٹک کے باہر کھڑی بھیڑ کو بھی دیکھ لیتے۔ آہستہ آہستہ ان کے آدمی بھی بھیڑ کا حصہ بنتے جا رہے تھے... پھر انھوں نے پرتاپ اور اونکار کو دیکھا جو اپنے ہم عمر لونڈوں کے ساتھ ایک الگ گوشے میں کھڑے تھے... پھر انھوں نے تھانہ انچارج کو دیکھا جو ابھی ابھی تبدیل ہو کر آیا تھا اور وائرلیس پر ایس پی سے کہہ رہا تھا کہ پولیس ہیڈکوارٹر سے کچھ کمک بھیج دی جائے، حالات بےقابو ہو سکتے ہیں... پھر انھوں نے محمود صاحب کو دیکھا جن کی جیب میں ان کے ۱۰۵ روپے ابھی بھی پڑے ہوں گے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ رام دین اتنی دیر میں نیلے کو دیہات کی گڑھی میں جا کر چھوڑ آیا ہوگا۔ پھر انھوں نے بہ آواز بلند محمود صاحب سے کہا:

"محمود میاں، میرے دونوں لڑکے بھی یہیں ہیں۔ آپ بھی ذرا اپنے صاحب زادے کو بلا لیجیے تا کہ آپ کو یہ شکایت نہ رہے کہ میرے بیٹوں کو تو میرے ساتھ تھانے میں آنے دیا گیا اور آپ کو محروم رکھا گیا..."

محمود صاحب اس سخاوت کا مطلب نہیں سمجھے، لیکن انھوں نے جلدی جلدی آوازیں دے کر بیٹے کو تھانے میں بھیجنے کے لیے کچھ لوگوں کو ہدایتیں دیں۔ ان کا بڑا بیٹا بھیڑ میں ہی موجود تھا،

آ کر ان کے پاس خاموش کھڑا ہو گیا۔

ٹھاکر صاحب نے انچارج کے کان کے پاس جا کر کچھ سرگوشی کی۔ انچارج کا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ٹھاکر صاحب نے اس کے منھ کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ اب ان کے چہرے پر ان کا پرانا اعتماد لوٹ آیا تھا، کیوں کہ تھانہ انچارج کا منھ ابھی بھی اتنا کھلا ہوا تھا کہ اندر سے پان میں رنگی داڑھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

"محمود میاں!" ٹھاکر صاحب نرمی سے بولے۔ "آج آپ کی بیٹی کی شادی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی تقریب میں کوئی بدمزگی ہو..."

محمود میاں اور ان کا بیٹا دونوں اس جملے کا مطلب نہیں سمجھے۔ ٹھاکر نے ان کی اس نافہمی کا لطف لیا اور ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولے، "آج آپ نے شادی میں بلا کر مجھ سے اپنا سیاسی بدلہ لینے کے لیے، مجھے بدنام کرنے کے لیے، میرے نیلے کو دھتورا کھلوایا... آپ کے بیٹے نے اپنے ہاتھ سے دھتورا کھلایا... سینکڑوں آدمی اس بات کے گواہ ہیں۔ کیوں میاں، تم نے نیلے کو کچھ کھلایا تھا کہ نہیں؟"

محمود صاحب کا بیٹا حیران رہ گیا۔

"میں نے تو گڑ کھلایا تھا..."

"کون یقین کرے گا کہ آپ میرے جانور سے اتنی محبت کر سکتے ہیں؟ آپ تو اس وقت میری عزت کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

بازی پلٹتی دیکھ کر محمود میاں کا رنگ فق ہو گیا۔ لیکن انھوں نے پڑھے لکھوں والا ایک پینترا چلا۔

"نیلے کا میڈیکل چیک اپ کروا کر دیکھیں گے۔"

ٹھاکر صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک کونے میں لے گئے۔ بھیڑ خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ انچارج وائرلیس پر ملاجی کی خیریت معلوم کرتا رہا...

ٹھاکر صاحب نے محمود صاحب سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا، "نیلا گڑھی پہنچ چکا ہے اور اب تک اسے برائے نام ہی سہی لیکن اتنا دھتورا کھلایا جا چکا ہو گا کہ میڈیکل رپورٹ میں آ جائے۔

کوئی اس بات کا یقین نہیں کرے گا کہ میں نے اسے دھتورا کھلایا ہے، کیوں کہ قصبے کی آدھی آبادی اور آپ کی پوری بارات نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپ کے صاحب زادے نے اسے گڑ میں ملا ملا کر خوب دھتورا کھلایا... اب جیسا آپ بہتر سمجھیں، میں تو بہرحال آپ کا شبھ چنتک ہوں۔ میں نہیں چاہوں گا کہ جس بہن کی آج رخصتی ہو رہی ہے اس کے بھائی کو حوالات میں بٹھا کر سوالات کیے جائیں..."

محمود میاں کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی۔ آج بہت عمدہ موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ بیٹے کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کم بخت نیلے کو گڑ کھلائے، اور وہ بھی سب کے سامنے کھلائے!

ٹھاکر صاحب کرسی کی پشت سے پوری پیٹھ لگائے اطمینان کے ساتھ تنے بیٹھے تھے۔ اس طرح بیٹھ کر جو بات کہی جائے اس میں بڑا وزن پیدا ہو جاتا ہے۔

انچارج نے موقعے کو بڑی جلدی پڑھا اور محمود صاحب سے کہا، "۳۰۲ کی رپورٹ تب تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک موت واقع نہ ہو جائے... ۳۰۷ کی رپورٹ لکھی جا سکتی ہے لیکن کون لکھوائے گا؟ میں اپنی طرف سے کیس کو تبھی درج کروں گا جب مجھے یہ علم ہو جائے کہ مارنے والا کون تھا اور اس کی ولدیت کیا تھی۔ ٹھاکر صاحب تو کہتے ہیں کہ اس نیلے سے ان کا اتنا ہی سمبندھ ہے کہ وہ ان کی گڑھی میں حویلی میں آ جاتا ہے تو وہ اسے کھانا دے دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنا پالتو ماننے کو تیار نہیں ہیں..."

"یہ سچ بھی ہے،" ٹھاکر اودل سنگھ مضبوط لہجے میں بولے۔ "نہ تو اس کی گردن میں میرا پٹا ہے نہ اسے پالنے کا کوئی نمبری لائسنس میرے پاس ہے!"

"تو اسے گولی سے اڑا دیجیے!" محمود صاحب کا بیٹا جوش میں چلایا۔

"ضرور اڑا دیجیے۔ لیکن قصبے کی آدھی آبادی آپ کی دشمن ہو جائے گی کہ یہ گئو ہتیا ہو گی۔ میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے، لیکن آپ کو اپنا سمجھ کر کہہ رہا ہوں..." ٹھاکر صاحب اب ماہر شہسوار کی طرح دلکی چل رہے تھے۔

اب انچارج نے اپنی باری سنبھالی۔

"اہم بات یہ ہے کہ ملاجی کی اصل چوٹ سر کی چوٹ ہے جو دکان کے چبوترے سے

ٹکرانے کی وجہ سے لگی۔ پیٹھ پر تو نیلے کا معمولی دھکا لگا تھا..."

"کیا وہ جان بوجھ کر دکان کے چبوترے سے ٹکرائے تھے؟" محمود صاحب کا لڑکا بولا۔

"نہیں..." انچارج رسان سے گویا ہوا۔ "لیکن فوجداری عدالت میں اس قسم کی باریکیاں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں... پھر نیلے پر مقدمہ کیسے چلایا جا سکتا ہے جب کہ ٹھاکر صاحب اسے اپنا پالتو ماننے پر راضی ہی نہیں ہیں..."

"واہ! گڑھی اور حویلی کی حفاظت کرے تو پالتو اور کہیں غلط حرکت کر جائے تو غیر..." محمود صاحب کا لڑکا بہت طیش میں تھا۔

ٹھاکر صاحب مسکراتے رہے۔ اس درمیان اپنے بیٹوں اور ان کے ساتھیوں کی مدد سے وہ مجمعے میں یہ شوشہ چھوڑ چکے تھے کہ نیلے کو دھتورا کھلا کر وقتی طور پر پاگل کرنے والا کوئی اور نہیں ان کے قریبی مخالف محمود صاحب کا بیٹا ہے جو اپنے جرم کا اقرار تھانہ انچارج کے سامنے کر چکا ہے۔ مجمعے کے تیور بھی بدلتے جا رہے تھے۔ جوش و خروش اچانک کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"پھر ایک اہم بات اور..." انچارج نے قانون کی کتاب کا ایک سبق یاد کر کے بتایا۔ "اگر ٹھاکر صاحب آپ کے حوالے نیلے کو کر بھی دیں تو آپ اس کو مار نہیں سکتے۔ ایک تو عوامی رائے آپ کے خلاف ہو گی کیوں کہ یہ گئو پریوار کا مانا جاتا ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیوں کہ میں تو سرکاری ملازم ہوں، صرف قانون کی بات سمجھ سکتا ہوں اور سمجھا سکتا ہوں۔ ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ اسے یوں بھی نہیں مار سکتے کہ قانون مجریہ ۱۹۷۲ کے مطابق اسے مارنا جرم قابلِ دست اندازی پولیس ہے اور اس کی سزا..." وہ چپ ہو گیا اس سے زیادہ بولنا ضروری بھی نہیں تھا کہ محمود صاحب اب رازداری کے لہجے میں ٹھاکر صاحب سے مشورہ کر رہے تھے کہ اگر ملاجی بچ جائیں تو ٹھاکر صاحب کو کیا خدمت کرنا چاہیے اور خدانخواستہ کام آ جائیں تو ان کی بیوہ کو کیا دینا چاہیے۔

انچارج نے پھاٹک پر جا کر پہلے تو سب کو یہ بتایا کہ "ایسے موقعوں پر بدلے اور انتقام سے زیادہ اس بات کی پروا کرنی چاہیے کہ مضروب کو جلد از جلد اسپتال لے جایا جائے۔ آپ میں سے کسی نے یہ کام کیا؟ ان کو اسپتال تک لے جانا تو بڑی بات، اٹھا کر پانی ہی پلا دیا ہوتا۔" مجمعے کو

سانپ سونگھ گیا۔

"دھارمک رنگ دینے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کا انجام فساد بھی ہو سکتا ہے جس میں دسیوں بے گناہ مارے جا سکتے ہیں۔" مجمعے کو دوسرا سانپ سونگھ گیا۔

پھر اس نے دیسی گالیوں اور بدیسی کرمنل کوڈ کی مدد سے مجمعے کو بتایا کہ مجمعے کا ہر آدمی کم از کم دو تین دفعات کی زد میں ہے۔ جب وہ سارے سانپ سنگھوا چکا تو آ کر اپنی کرسی پر یوں اکڑ کر بیٹھ گیا جیسے تھانہ انچارج کو بیٹھنا چاہیے۔

جب وائرلیس پر ملاجی کی موت کی اطلاع ملی تب اس نے پوز میں قدرے فرق لانا مناسب سمجھا۔

اس درمیان مجمع چھٹ چکا تھا۔ وہ رات ٹھاکر صاحب نے حویلی میں نہیں گڑھی میں گزاری۔ ملاجی کے خاندان کو ٹھاکر اودل سنگھ نے خاطر خواہ تاوان دیا اور محمود صاحب نے مشورہ دیا کہ اس روپے کو خاموشی سے لے کر کام میں لے آو ورنہ مسلمانوں کو معلوم ہو گیا تو تمھاری عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔

انھوں نے سمجھایا:

"اور ویسے بھی اس واردات میں ٹھاکر اودل سنگھ کا کیا قصور ہے؟ دراصل نیلا ان کا پالتو جانور تو ہے نہیں۔ اس کا مطلب وہ وحشی ہے۔ وہ وحشی اس لیے ہے کہ ٹھاکر صاحب نے اس کے گلے میں اپنا پٹا تو ڈالا نہیں ہے۔ تو اگر وہ وحشی ہے تو وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے، اور کیوں کہ وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے تو اس میں جانور کا کیا قصور؟ کیوں کہ ایک اعتبار سے جانور ایک الگ چیز ہے اور اس کی وحشت ایک الگ چیز، اس لیے کہ جانور پر وحشت ہمیشہ طاری رہتی نہیں، کبھی کبھی آتی ہے۔ تو جو چیز کبھی کبھی آتی ہے اس کے لیے جانور بھی مستقل مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔ تو جانور اگر وحشت سے الگ ایک چیز ہے تو اسے جانور پہلے سمجھنا چاہیے اور وحشی بعد میں۔ تو اگر وہ پہلے ایک جانور ہے اور وحشی بعد میں، تو اس صورت میں فیصلہ اس کی جانور والی حیثیت سے کرنا چاہیے نہ کہ وحشت والی حیثیت سے۔ اگر وحشت والی حیثیت سے فیصلہ کرنا ہے تو صرف حالتِ وحشت کے وقت ہی وہ فیصلہ مناسب جانا جائے گا نہ کہ ہر حالت میں۔ اور کیوں کہ وہ اس

وقت وحشت والی حالت میں تو ہے نہیں، صرف جانور والی حالت میں ہے، تو اس صورت میں..."
ملّاجی کے خاندان والے راضی ہو گئے۔
محمود صاحب نے خود پر اندر ہی اندر ناز کیا کہ وہ بھی اگر کوشش کریں تو ٹھاکر اودل سنگھ کے انداز میں خاصی دیر تک گفتگو کر سکتے ہیں، یعنی ایسی گفتگو جس میں جھوٹ کبھی بھی نہیں ہوتا، یعنی ہر لفظ سچا ہوتا ہے، لفظ کے معنی بھی سچے ہوتے ہیں اور ان لفظوں میں جو لفظ ملا کر بولے جاتے ہیں وہ بھی سچے ہوتے ہیں، اور ان لفظوں کے اور ان کے علاوہ جو دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان الفاظ کے معنی بھی سچے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان معنی میں جس خیال کی آمیزش اور آمیزش میں جو ایک قسم کی معنوی حقیقت ہوتی ہے اور حقیقت میں جو اصلیت...

❖

ایک عرصے سے شہر کی منڈی کا مزاج بدل رہا تھا اس مزاج کا اثر قصبے اور دیہات پر پڑنا بھی لازمی تھا۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر تبدیلی آ رہی تھی۔ لیکن حالیہ دنوں میں کچھ تبدیلیاں اچانک اور واضح طور سے سامنے آنے لگی تھیں۔
ٹھاکر اودل سنگھ تبدیلی کو بہت جلد قبول کرتے تھے۔ دیہات میں سب سے پہلے آر آر _21 اور کے_68 گیہوں بیج کے طور پر انھوں نے ہی استعمال کیا تھا۔ یوریا کھاد سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنے کھیتوں میں استعمال کی۔ تھریشر اور ٹریکٹر تو ضلعے میں سب سے پہلے ان کے یہاں آیا تھا۔ کس چیز پر کتنی رعایت ملتی ہے، انھیں ازبر رہتا تھا۔ کس شہر میں کیا کیا نئی چیزیں استعمال ہو رہی ہیں، انھیں سب سے پہلے معلوم ہو جاتا تھا۔ وہ ترقی کرنے اور پیسہ کمانے کے ہر ہنر سے واقف تھے۔ بس پیسے کا صحیح استعمال ایک ایسا باب تھا جس میں وہ زیادہ دل چسپی نہیں لیتے تھے۔ وہ اقتدار اور پیسے کو ایک دوسرے کا حامی و مددگار سمجھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ ان میں کوئی بھی چیز ایک دوسرے کے بغیر نہیں حاصل کی جا سکتی۔ اقتدار کیوں کہ چھو کر محسوس کی

جانے والی چیز نہیں (اور اس بات کا انھیں بہت افسوس تھا) اس لیے وہ اس کے بدل یعنی پیسے کو بہت حفاظت سے جمع کرتے تھے۔ اور اسی لیے نفسیاتی طور پر وہ نیلے کی ضرورت کے محتاج تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی وجہ سے بدنامی بھی بہت ہوئی لیکن وہ ساری بدنامیاں پیسے سے دھوئی جا سکتی تھیں ـــ اور دھوئی جاتی رہی تھیں ـــ اور پیسے کی حفاظت میں نیلے کا بڑا حصہ تھا۔ کبھی تو وہ بہت سنجیدگی سے یہ بات سوچتے کہ ان جیسے دولت مند اور صاحب اقتدار کے پاس اس قسم کا ایک ہتھیار ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں، کہ کچھ فتنے اسی لیے پالے جاتے ہیں کہ وہ بُرے وقت میں ساتھ دیں یا اچھے وقت کو اَور بہتر بنائیں۔

مال اور اقتدار کی اس بھاگم بھاگ آنکھ مچولی میں وہ کچھ معمولی چیزیں نظر انداز بھی کر گئے تھے ـــ جیسے اپنی خانگی زندگی، ذاتی سکون اور ضمیر وغیرہ۔

جب سے منڈی کے مزاج میں اچانک تبدیلیاں آئی تھیں، وہ دن رات اپنی دیہاتی آراضی کی معیشت اور قصبے کی کاروباری زندگی کو شہر کی نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ انھیں اتنا اطمینان ہر حال میں رہتا تھا کہ اگر ان کی آنکھیں بند ہو جائیں تو ان کے وارث موجود ہیں جو ان کے اقتدار اور تموّل دونوں کو بہت سبک دستی کے ساتھ خود تک منتقل کر لیں گے۔ جہاں تک اپنی زندگی کا معاملہ تھا وہ مطمئن تھے کہ جب سے نیلا پالا ہے ان کی گڑھی اور حویلی کے علاقے میں دہشت پھیل گئی ہے اور کوئی ان کی دولت اور اقتدار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

ٹھاکر اودل سنگھ شہر کی منڈی کی تبدیلیوں سے اپنی معیشت کو ہم آہنگ کرنے اور قصبے کی سیاست میں خود کو مستحکم کرنے اور دیہات کی آراضی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مستقل لگے رہتے۔ ان کے بیٹے بھی ان کے مددگار تھے، حالاں کہ یہ اَور بات ہے کہ ان کا مزاج اور عادتیں ٹھاکر کے مزاج اور عادتوں سے قدرے مختلف تھیں۔ خود دونوں بیٹوں کا مزاج ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا۔ بڑا پرتاپ اپنی بیوی کے ساتھ مگن، دیہات کے لوگوں میں زیادہ مصروف رہتا۔ اسے اندازہ تھا کہ ان کے خاندان کی ساکھ کی اصلی بنیاد دیہات کی آراضی ہے۔

چھوٹا اونکار دیہات، قصبے اور شہر تینوں میں دل چسپی لیتا تھا اور نتیجتاً کسی بھی ایک جگہ لگ

کر کام نہیں کر پاتا تھا۔ باپ کا زیادہ منظور نظر وہی تھا۔ زندگی کے دوسرے مظاہر میں بھی اس کی دل چسپی زیادہ تھی۔ حالاں کہ پچھلے سال اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور بیوی بھی بڑی خوب صورت اور چلبلی ملی تھی، لیکن وہ قدرت کی دیگر نعمتوں کا منکر نہیں بننا چاہتا تھا۔

❖

ادھر کچھ دنوں سے گاؤں کے ایک حصے نے محسوس کیا کہ ان کو ان کا پورا حق بھی نہیں ملتا۔ نہر کا بما سب کی مشترکہ ملکیت تھا، لیکن اس کی زیادہ تر نالیاں ٹھاکر کے اپنے کھیتوں میں یا اس کی موافقت والوں کے کھیتوں میں کھلتی تھیں۔ پرانی پیڑھی بمبے کی ان نالیوں کو بمبے کی تعمیر کا ایک جز سمجھتی تھی لیکن جب سے لونڈے جوان ہوئے تھے، کہنے لگے تھے کہ بمبے میں نئی نالیاں بھی بنائی جا سکتی ہیں اور یہ کہ کچھ پرانی نالیوں کو بند بھی کیا جا سکتا ہے، کہ ان کی وجہ سے کبھی کبھی پانی بہت برباد ہو جاتا ہے۔ وہ اکثر اس قسم کی شکایت لے کر ٹھاکر کے پاس آتے تو گڑھی کے دروازے پر کھڑا نیلا سینگ آگے کر کے انھیں روک دیتا۔ وہ الٹے قدموں واپس تو چلے جاتے لیکن دل ہی دل میں آگے کے منصوبے بناتے ہوئے واپس جاتے۔

ضلع پریشد سے کوئی اسکیم اگر گاؤں کے لیے پاس ہوتی تو اس کا فائدہ بھی ان گھرانوں کو ہی ملتا جو ٹھاکر کے زیادہ قریب تھے۔ ٹھاکر نے سیاست کے طور پر اپنے گھر سے دور گاؤں کی سرحد پر بنے دو ایک گھرانوں کو بھی مراعات کا حصے دار بنا رکھا تھا تا کہ گرام پنچایت میں کوئی یہ شکایت نہ کر سکے کہ ٹھاکر صرف ان گھرانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے جن کی دیواریں اس کی گڑھی سے ملی ہوئی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ سرحدی گھرانے بھی اس کی حمایت کا دم بھرتے رہتے اور گاؤں میں ایک طرح کا توازن قائم رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ توازن اکثر ٹھاکر کے ہی حق میں جاتا تھا۔ گاؤں کی حد تک ٹھاکر کی کوشش بھی یہی رہتی کہ توازن اس کے اور اس کی حمایت والوں کے ہی حق میں رہے۔ متاثرہ افراد کا سامنا ٹھاکر سے ہو ہی نہیں پاتا تھا کہ گڑھی کے دروازے پر نیلا انھیں روک

دیتا تھا۔ غیر فطری غذا کھا کھا کر نیلے کی جبلت میں بھی کچھ حیرت انگیز تبدیلیاں ایسی آ گئی تھیں کہ وہ کبھی کبھی خود بخود گڑھی سے نکل کر ان متاثرہ افراد کے گوشے میں پہنچ کر ان کے گھروں میں گھس کر توڑپھوڑ مچاتا، اور بچوں اور عورتوں کو کھوندتا ہوا، اینڈھتا ہوا واپس آ جاتا۔ ٹھاکر کی شہہ، پجاری کی موافقت اور قانون کے ڈر کی وجہ سے کوئی اسے براہِ راست گزند نہیں پہنچا پاتا تھا۔

قصبے میں، جو ٹھاکر کی سیاست کا مرکز تھا، کم و بیش یہی حالت تھی۔ البتہ شہر کے حکام کبھی کبھی ٹھاکر کو تنبیہ کر دیتے تھے۔ شہر کے حکام بھی صرف اسی حد تک تنبیہ کرتے تھے جس حد تک وہ ضروری سمجھتے تھے تاکہ دوسرے قصبے والے زیادہ اُلار نہ ہو جائیں۔

زندگی بہت خاطر خواہ توازن کے ساتھ چل رہی تھی۔ گڑھی میں پرتاپ کی بیوی نے بچوں کی ہنڈکلیا پکوائی۔ محلّے پڑوس کے لوگوں کو بھی بلایا۔ کمھار کی بیوہ پچھلے موسم میں اپنے پتی کے پاس جا چکی تھی۔ چھٹکی بیاہ کر اپنی بڑی بہن کے منگیتر کے گھر جا چکی تھی۔ بڑکی اب اپنے خاندان میں اکیلی تھی۔ برتن بنانے کا کام اکیلے اس کے بس کا نہیں رہ گیا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے بعد جب اپنا منگیتر ہی انکاری ہو گیا تو اس سے اَور کون شادی کرتا۔ وہ راضی بہ رضا زندگی گزار رہی تھی۔ گدھے بیچ کر اس کا پیسہ بڑی بہو کے پاس جمع کرا کے وہ گڑھی میں ہی چھوٹا موٹا کام کرکے وقت گزار لیتی تھی اور کبھی جھونپڑے میں اور کبھی بہو کے پائنتی سو جاتی تھی۔ اس کا منگیتر، یعنی بہنوئی، مقدمے سے بَری ہو گیا تھا، کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے پولیس کے کیس داخل کرنے سے پہلے ذاتی استغاثہ دائر کر دیا تھا اور پھر عدم پیروی میں اپنا کیس خارج کرا لیا تھا۔ ٹھاکر صاحب جانتے تھے کہ اس قسم کے فضول مقدموں کو جیت کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔

نئی بہو زیادہ چھواچھوت نہیں مانتی تھی۔ بڑکی کو خوب اچھی طرح نہا کر آنے کی ہدایت کی تھی اور جب وہ آئی تو اسے پوریاں بیلنے کو بٹھا دیا۔ بڑکی عزت افزائی پر خوش ہو کر جھوم جھوم کر پوریاں بیلنے لگی۔ اونکار بھی سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پرتاپ کے بچے وہیں رسوئی میں جمے بیٹھے ہنڈکلیا پکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اونکار کو محسوس ہوا کہ بڑکی اُس رات کے مقابلے میں اب کچھ تگڑی ہو گئی ہے۔ وہ اونکار کے اس احساس سے بے خبر جھوم جھوم کر پوریاں بیلتی رہی۔ ظاہر ہے جب وہ جھوم جھوم کر پوریاں بیلے گی تو پورا بدن جھُولے گا۔ جب پورا بدن جھُولے گا تو وہ حصے بھی

جھولیں گے جن کے بارے میں اونکار زیادہ متفکر تھا۔ بھائی کے بیٹے کو پیار کرنے کے بہانے اونکار نے جھک کر اس کی کُرتی پر نظر جمائی اور اگلی پوری بیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ بڑکی کو ہلکا سا احساس ہوا کہ اونکار بابو بہت قریب آ گئے ہیں، مگر وہ چپ رہی۔ جیسے ہی وہ بیلتے بیلتے آگے جھکی، اونکار نے بچے کو چومنے کے بہانے اپنا سر آگے کر دیا اور اس دفعہ کامیاب رہا کہ اس نے اپنی فکر کو دو بڑے بڑے میدے کے پیڑوں کی شکل میں مجسم دیکھ لیا تھا۔ لیکن اس بھی زیادہ اہم ایک اور بات ہوئی جس کا اونکار کو وہم وگمان بھی نہیں تھا۔

جس کا بدن برتتے وقت اس نے آنکھ پر پٹی باندھ دی تھی اگر ناک پر بھی باندھی ہوتی تو بڑکی اونکار کی سانس کی مہک محسوس کر کے آج چونکنا نہ ہوئی ہوتی۔ اس نے زندگی میں صرف ایک مرد کی سانس کی مہک سونگھی تھی، اس لیے اپنا مجرم پہچاننے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اب اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے آپ کو اور آگے جھکا دیا اور اونکار کا چہرہ دیکھے بغیر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس وقت اونکار کے دل کی کیا حالت ہو گی۔ اس طرح اس نے اونکار کی سانسوں کی مہک کی دوبارہ تصدیق کی۔ اس نے اُس رات جھونپڑے کی اذیتوں کو یاد کیا تو اسے ابکائی سی آ گئی۔ وہ تیزی سے پوریاں بیلتی رہی۔ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی تو اونکار بچے کو لیے لیے رسوئی کے دوسرے کونے میں جا کر بچوں جیسی باتیں کرنے لگا۔ آنے والی بڑی بھابھی تھی۔ وہ پوریاں بیلتی رہی اور بڑی بھابھی کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

رات کو اس نے بڑی بھابھی کے سر میں خوب طبیعت سے تیل لگایا، اس کی پیٹھ پر مالش کی، پھر اس کی ٹانگوں کو گود میں رکھ کر دیر تک اس کی پنڈلیاں دباتی رہی۔ جب بھابھی بدن دبواتے دبواتے تھک گئی تو بولی، "اب سو جا، بڑکی۔"

بڑکی آہستہ آہستہ رونے لگی۔

"کیا ہوا؟" بھابھی نے اچنبھے سے پوچھا۔

بڑکی نے اس کے دونوں پیر ہاتھوں میں تھامے اور ان پر اپنا سر رکھ کر بولی، "میرو یوؤن اونکار بابو نے لُوٹوائے۔"

وہ زمین پر اور بڑی بھابھی چارپائی پر لیٹی پچھلے موسموں کی وہ خوفناک رات یاد کرتی رہیں۔

اونکار کے دوست نے جہاں جہاں نیل ڈالے تھے وہاں ہاتھ پھیر کر بڑی بھابھی نے دانت پیستے ہوے رات کاٹی۔

دوسرے دن بڑکی اپنی بہن سے ملنے اس کے گاؤں چلی گئی اور دو تین دن بعد واپس آ کر اپنے کام میں لگ گئی۔ وہ اندر سے آتے جاتے نیلے کو کچھ نہ کچھ کھلادیتی۔ نیلا بھی اسے دیکھ کر اگر بیٹھا ہوتا تو اٹھ کر اس کے پاس آ کر اس کا ہاتھ چاٹنے لگتا تھا۔

ایک رات جب کہرا بہت شدید تھا اور گاؤں کے دھویں میں مل کر بہت گاڑھا اور ٹھوس ہو گیا تھا اور ہوائیں تیز تھیں اور جاڑا شدید تھا تو گڑھی کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے دو سائے بغیر آواز کے اندر کودے اور سیدھے اونکار کے کوٹھے میں پہنچے۔ اونکار کے پلنگ کے پاس پہنچ کر اس نے جو زیادہ تگڑا تھا، اونکار کے منھ پر ہاتھ رکھ کر گردن دبائی اور گٹھری کی طرح باندھ لیا۔ دوسرے نے اونکار کی سوتی ہوئی بیوی کو، جو چونکی تک نہیں تھی، اس انداز سے بے قابو کیا کہ اس کا ایک ہاتھ تو تکیے کے ذریعے اس کا منھ دبائے ہوے تھا اور دوسرا ہاتھ چاقو تھامے تھا جس کی چمک اونکار کی بیوی کو اندھیرے کے باوجود نظر آ رہی تھی۔ وہ گھگھیانے سی لگی مگر آواز تکیے کی دبازت میں گھٹ کر رہ گئی۔ پھر اس نے اطمینان سے اسے اچھی طرح باندھا اور منھ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ تگڑا آدمی بڑی گٹھری کو لے کر گڑھی کے دروازے سے نکل گیا۔ دوسرا آدمی چھوٹی گٹھری کو لے کر سامنے کمہار کے جھونپڑے میں گیا اور اونکار کی بیوی کو پیال پر ڈال کر، آنکھوں پر پٹی باندھ کر، اپنے چہرے کا مڑاسا کھول کر پورا سبق یاد کیا جو اس کی سابقہ منگیتر اور حالیہ سالی نے اس کے گھر آ کر اسے پورا ماجرا بتا کر یاد کرایا تھا...

بڑکی اس درمیان نیلے کو کھوئے کے پھیکے پھیکے پیڑے کھلاتی رہی اور سرسوں کا خالص تیل پلاتی رہی۔ اور پہلوں سے اندازہ کرتی رہی کہ اب کیا ہو رہا ہو گا...

اگلی صبح بہت سی تازہ خبروں کے ساتھ طلوع ہوئی۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ اونکار گھر سے غائب تھا اور اس کے کپڑے نہر کے کنارے پائے گئے تھے۔

دوسری خبر یہ تھی کہ اونکار کی بیوی کو کوئی زبردستی اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ جان بچا کر بھاگ آئی۔ یہ خبر تو بالکل سچ تھی، کیوں کہ کسی نے اسے اٹھا کر لے جانے کی کوشش

تو کی تھی ـــــ یہ اَور بات ہے کہ وہ کامیاب بھی ہوا تھا۔ خبر کا دوسرا حصہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگ آئی، کہ بہر حال اس کی جان تو بچ ہی گئی تھی...

تیسری خبر یہ تھی کہ جب ٹھاکر نے اپنے پہرے کے نوکروں پر جوتے پڑوائے تو اس دفعہ انھوں نے کوئی اعتراف نہیں بلکہ صرف یہ واقعہ بیان کیا کہ بڑکی کے ہاتھ سے رات کو کھانا اور گڑ لے کر، کھانا اور گڑ کھا کر، وہ لوگ لیٹ گئے تھے اور معمول سے زیادہ دیر تک جاگتے رہے تھے کہ گڑ میں بہت کڑواہٹ تھی جیسی کہ پرانے گڑ میں پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر بے خبر سو گئے تھے، جیسا کہ روز سوتے تھے، کیوں کہ اب نیلے کی موجودگی میں انھیں چوکیداری کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔

چوتھی خبر یہ تھی کہ چھٹکی کا پتی گڑھی کے پیچھے مُردہ پایا گیا۔ اس کے سینے پر چاقوؤں کے کئی گھاؤ تھے۔ بعد میں میڈیکل رپورٹ نے بتایا کہ موت چاقو کے زخموں اور زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ معدے میں دھتورے کے بیج بھی پائے گئے۔

پانچویں خبر یہ تھی کہ بڑکی اپنے جھونپڑے میں مُردہ پائی گئی۔ بعد میں میڈیکل رپورٹ سے پتا چلا کہ اس کے معدے میں دھتورے کے بیج پائے گئے۔ اس کے بدن پر چوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا۔

ایک معمولی خبر یہ بھی تھی کہ بھیکو کا لونڈا اچانک پاگل ہو گیا ہے اور بار بار ڈوبتے ہوے آدمی کی نقلیں کرتا ہے اور ہنستا ہے...

ایک ضمنی خبر یہ بھی تھی کہ بڑی بہو نے پرتاپ سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ یا تو وہ اسے میکے بھیج دے یا پھر اس کے ساتھ آ کر گڑھی میں رہے۔ اس ضمنی خبر میں ایک ضمنی ٹکڑا یہ بھی تھا کہ بڑی بہو کو اب نیلے سے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔

علاقے کی پولیس نے اس متعدی قتل کیس میں بہت جی جان سے محنت کر کے تفتیش کی اور ایک ہفتے کے اندر اندر ایک ایک واقعے کی چُول سے چُول بٹھا دی۔

کمہار کی چھوٹی لڑکی، چھٹکی، کے خلاف چارج شیٹ داخل ہوئی جس کا لب لباب یہ تھا کہ چھٹکی بھیکو کے بیٹے کی آشنا تھی۔ ان دونوں کو نامناسب حالت میں دیکھ کر چھٹکی کے شوہر پر پاگل

پن کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے انتقاماً گڑھی میں جا کر کسی بہانے سے بڑکی کو بلایا اور کسی نہ کسی طرح راضی کر کے پہرے داروں کو اور پھر بڑکی کو دھتورا کھلا کر، خود بھی دھتورا کھا کر، بُری نیت سے بڑکی کو اس کے جھونپڑے میں لے گیا۔ لیکن اس درمیان اونکار کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے باہر آ کر جھونپڑے کے پاس جا کر چھٹکی کے شوہر کو للکارا۔ چھٹکی کے شوہر نے اونکار پر قابو پا لیا اور راز کھلنے کے ڈر سے اس کی گٹھری بنا کر نہر میں ڈبو دیا۔ نہر کی پٹری پر بھیکو کے بیٹے نے یہ ڈوبنے والا منظر دیکھا اور ہوش وحواس کھو بیٹھا اور دوسرے گاؤں جا کر چھٹکی کو بلا لایا۔ چھٹکی نے جب یہ سنا کہ اس کا شوہر بڑکی کی عزت لوٹنا چاہتا تھا تو وہ غصے میں گاؤں آئی اور اس نے اپنے دھتورے کے نشے میں مدہوش شوہر کو اونکار کی بیوی کو اٹھا کر لاتے اور پھر اسے جان بچا کر بھاگتے دیکھا تو یہ سوچ کر طیش میں آ گئی اور سوچا کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے میری بہن کی عزت لُوٹنا چاہی اور اب ایک معصوم انسان کا قتل کر کے اس کی بیوی کی عزت لوٹنا چاہتا ہے، یہ سوچ کر تیسے میں آ کر اس نے دھتورے کے نشے میں مدہوش شوہر کو چاقو سے مار مار کر ختم کر دیا اور اور بھاگ کر اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ بھیکو کا بیٹا یہ دو قتل دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ شہادت کے طور پر چھٹکی کے گاؤں کے کچھ لوگوں کا نام دیا گیا تھا جو اس بات کے چشم دید گواہ تھے کہ پچھلے دو روز سے بھیکو کا بیٹا چھٹکی اور اس کے شوہر سے ملنے آ رہا تھا...

چھٹکی نے زنانہ حوالات کی سلاخوں سے سر نکال کر سوچا کہ وہ تو کہیں آئی نہ گئی، اس نے اپنے پتی کا خون کیوں اور کیسے کر دیا؟ میں نے تو بھیکو کو بڑکی کے ساتھ تین دن پہلے اپنے گاؤں آتے دیکھا تھا تو پوچھنے پر بڑکی نے بتایا کہ بھیکو اپنی پتنی کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اسی لیے دونوں چھٹکی کے پتی کے پاس روز مشورہ کرنے آتے ہیں۔ میں چوکے میں بیٹھی ان تینوں کے لیے کچوریاں بناتی رہتی اور یہ تینوں باہری کوٹھے میں سر جوڑے بیٹھے بیاہ کی بات کرتے رہتے۔ جاتے وقت بڑکی میرے پتی کو بلا گئی تھی کہ وہ آ کر اس کے گاؤں میں بھیکو کے بھائیوں سے بیاہ کی بات کر لے... وہ اپنا دیہاتی دماغ لڑاتی رہی۔

بھیکو کے گھر جانے کے بجائے میرا پتی بڑکی کے جھونپڑے پر پہنچا ہو گا۔ وہاں اسے اکیلا دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی ہو گی ــــ پہلے تو سگائی اسی سے ہوئی تھی نا۔ بڑکی بھی اب تک

میرے پتی کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ میرا پتی بھی اکثر لڑائی میں الاہنا دیتا تھا کہ اس سے اچھا تو میرا بڑکی سے بیاہ ہوا ہوتا۔

بھیکو کے گھر بیاہ کی بات کرنے جب دونوں نہیں پہنچے ہوں گے تو بھیکو کا بیٹا ان کی تلاش میں جھونپڑے پر آیا ہو گا۔ جھونپڑے میں دونوں کو ایک ساتھ لیٹا دیکھ کر وہ اونکار بابو کو بلالایا ہو گا۔ بڑکی کا گرم گرم بچھونا چھوڑنے کے غصّے میں میرے پتی نے اونکار کو مار کر نہر میں ڈبو دیا ہو گا۔ بھیکو کا بیٹا یہ دیکھ کر پورا پاگل ہو گیا ہو گا۔ واپسی میں میرا پتی پھر بڑکی کے جھونپڑے پر گیا ہو گا۔ اتنے میں گڑھی سے اونکار کی بیوی نے آ کر میرے پتی کو چاقو سے گود دیا ہو گا۔ بڑکی یہ سب دیکھ کر دھتورا کھا کر مر گئی۔ اگر وہ بڑکی کے ساتھ سونے کا ایسا ہی شوقین تھا تو اس کا جو انجام ہوا وہ اچھا ہی ہوا۔ یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا، کہ اچانک اسے اپنا اور بڑکی کا بچپن اور لڑکپن اور شروع جوانی کا ساتھ یاد آیا۔ پھر اپنے مرے ہوئے پتی کا گٹھا ہوا مضبوط شریر یاد آیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کا پتی شہر سے اس کے لیے ہمیشہ پیڑے لاتا تھا اور پیڑے کھا کر گرم گرم دودھ پی کر وہ دونوں چھت پر سونے چلے جاتے تھے۔ اچانک اسے اپنے شوہر کے قاتل اونکار کی بیوی سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ سلاخوں کے باہر آہٹ ہوئی۔ پولیس کی زنانی نے آ کر اس سے پانی کے لیے پوچھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بہتا گدلا گدلا پانی پونچھا اور ہاتھ کے اشارے سے پانی کو منع کیا۔

❖

باہر سُسر جی نے پہرے کے نوکروں کو ابھی ابھی پٹوایا ہے۔ جٹھانی صبح سے روتے روتے ابھی چپ ہو کر جیٹھ جی کے ساتھ اپنے کمرے میں گئی ہیں۔ نیلا سسر جی کے پاس کھڑا دُم کو چکر دے رہا ہے۔

وہ کون تھا جو مجھے باندھ کر جھونپڑے میں لے گیا تھا؟ اور پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کس بری طرح میرے بدن کی درگت بنائی تھی۔ پھر رک رک کر سوچ سوچ کر کیسے اس نے

میرے شریر کی بے عزتی کی تھی۔ پھر کیسے میرے جسم کو بنا ڈھکے وہ جھونپڑے سے نکل کر بھاگا تھا۔ میں کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد رسی کھول کر آنکھوں کی پٹی ہٹا کر خود کو گڑھی کے اندر لے گئی تھی، جہاں دروازے پر نیلا چپ چاپ کھڑا مجھے اپنے کمرے میں جاتے دیکھتا رہا تھا۔ کسی کو خبر نہیں ہو پائی کہ اس رات میری عزت لٹی تھی۔

وہ کون تھا؟ چھنکی کا پتی یا بھیکو کا لڑکا؟ وہ بھیکو کا لڑکا ہی ہو گا، کیوں کہ اس کی پتنی کو نیلے نے زخمی کیا تھا اور سسرجی نے آخر تک غلطی نہیں مانی تھی۔ اس نے اس طرح اپنا انتقام لیا۔ پھر آخر اونکار کو چھنکی کے پتی نے کیوں نہر میں ڈبویا؟ اس نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ پھر بڑکی دھتورا کھا کر کیوں مر گئی؟ وہ تو جٹھانی کے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ وہاں سے کب نکل کر آ گئی تھی؟ جٹھانی کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ کیا بڑکی نے جٹھانی کو بھی سونے سے پہلے تھوڑا سا دھتورا کھلا دیا تھا؟ یہ چھنکی کا میاں اور بڑکی اس واقعے میں کہاں سے آ گئے؟ اور یہ دونوں مر کیوں گئے؟ ان دونوں کو کس نے مارا؟

اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یقیناً ایسا ہوا ہو گا کہ چھنکی نے رات کو آ کر گڑھی کے پیچھے اپنے پتی اور بڑکی کو بُری حالت میں دیکھا ہو گا۔ دھتورے کے نشے میں چُور اپنے پتی کو چاقو سے مارنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہو گی۔ البتہ بڑکی کو بڑی بہن سمجھ کر معاف کر دیا ہو گا۔ مگر بڑکی شرمندگی سے بچنے کے لیے دھتورا کھا کر جھونپڑے میں آ کر سو گئی ہو گی۔ مگر اونکار کو چھنکی کے پتی نے نہر میں کیوں ڈبویا؟

باہر کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ گڑھی کے دروازے کے باہر بھیکو کا بیٹا زمین پر پڑا ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقل کر کے گھٹی گھٹی آواز میں چلّا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی زور سے بند کی اور پلنگ پر اوندھی لیٹ کر سسکنے لگی۔

❋

بڑی بہو نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی۔ اب رات ہو گئی تھی۔ پرتاپ چت لیٹا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ اس نے ظاہر کیا جیسے وہ سو رہی ہے۔ ویسے بھی پچھلے کئی دنوں سے سونے اور جاگنے میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا۔ کھڑکی کے باہر آنگن میں سسرجی ابھی تک ٹہل رہے تھے۔ بڑی بہو کی سمجھ میں جہاں کچھ اور باتیں نہیں آئی تھیں وہیں یہ بات بھی دھند لکے میں تھی کہ کیا واقعی چھوٹی بہو بیچ راستے سے عزت بچا کر بھاگ آئی تھی۔ کیا اس کے شریر پر نیل نہیں پڑے؟ کیا اس کا پنڈا کورا ہی ہے؟ اس احساس سے ہی اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ جب جب وہ یہ سوچتی اسے سانس سینے میں گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی لاج بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہو۔ یقیناً یہی بات ہے، ورنہ ایسے ٹانگیں پھینک پھینک کر کیوں چل رہی تھی۔ اس نے پھر کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی کے بالکل نزدیک ایک سایہ کھڑا تھا۔ وہ چیخنے ہی والی تھیں کہ اسے نیلے کی سانسیں سنائی دیں۔ نیلا کھڑکی کے پاس تھوتھنی کیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا...

"اٹھیے... اٹھیے..." وہ تیز سرگوشیوں میں پرتاپ سے مخاطب ہوئی۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" پرتاپ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں... مجھے نیلے سے ڈر لگتا ہے... کھڑکی کے پاس کھڑا ہے..." وہ بیٹھی تھر تھر کانپتی رہی۔

❋

ٹھاکر اودل سنگھ نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر اپنی سانسیں درست کیں۔ آنگن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ کر انھوں نے یاد کیا کہ اونکار بچپن ہی سے کتنا ضدی تھا۔ میلے میں جاتا تو ہر اچھی چیز کے لیے پسر جاتا۔ مٹی کی ڈھیر ساری گڑیاں، شیر، بھالو، غبارے، رنگین کاغذ کی پتنگیں، اور جانے کیا کیا الابلا

گود میں اٹھائے لے آتا اور پھر تھوڑی دیر میں ہر چیز توڑپھوڑ کر برابر کر دیتا۔ چیز حاصل ہونے کے بعد اس کے لیے بے قیمت اور بےوقعت ہو جاتی تھی۔ آج وہ سینکڑوں من پانی کے نیچے دبا ہوا ہو گا۔ مچھلیوں نے بدن پر گوشت کا ریشہ بھی نہ چھوڑا ہو گا۔ کرنی کا پھل تو ملتا ہی ہے مگر اسی جنم میں اسے کیوں مل گیا، اس کا انھیں افسوس تھا۔ انھوں نے آسمان کی طرف دکھی نظروں سے دیکھا، کیوں کہ اس جنم میں تو وہ اس کے باپ تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک طرف سے مہاوٹ کی بدلیاں بڑھی چلی آ رہی تھیں اور تارے ان بدلیوں میں آہستہ آہستہ کھوتے جا رہے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے سردی کچھ کم لگ رہی تھی۔ پہرے کے نوکر ڈ‎ڈھی کے دروازے پر ان کی طرف پیٹھ کیے بیڑی پی رہے تھے۔ نیلا بڑے بیٹے کے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑکی میں جھانک رہا تھا۔ چھوٹی بہو اپنے مائیکے والوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لیٹ چکی تھی اور اس کے کمرے کی روشنی دھیمی ہو چکی تھی۔

اونکار ان کے سامنے کھڑا تھا... اونکار ان سے پیسے مانگ رہا تھا... وہ اونکار کو پیسے دے رہے تھے... اونکار نے ان سے شہر جا کر سنیما دیکھنے کی آ گیا چاہی، انھوں نے اجازت دے دی... اونکار چلا گیا... اونکار پھر آ گیا... اتنی مدت میں کچھ بڑا ہو گیا تھا... انھوں نے اونکار سے کہا کہ چیئرمینی کا الیکشن جیتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ کچھ تگڑے پٹھے بھی ساتھ میں ہونا چاہیے، کبھی کبھی دوٹوں والا بکسا بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اونکار موٹرسائیکل پر گیا اور ٹریکٹر کی ٹرالی میں تگڑے تگڑے پٹھوں کو بٹھا کر لے آیا۔ یہ نریش ہے، یہ سلطان ہے، یہ رمیش ہے (اور اس کے چہرے پر گھاؤ کے دو نشان تھے)، یہ بلّا ہے، یہ بہاری ہے... پھر وہ الیکشن جیت گئے تھے...

"اونکار... بیٹا! اسکول کے پاس والے پلاٹ پر اگر کل امبیڈکر جینتی کا سماروہ ہو گیا تو یہ پلاٹ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہاتھ سے چلا جائے گا... ہم کسی کو وہاں سماروہ منانے سے روک بھی نہیں سکتے... بس آج کی رات ہمارے پاس ہے..." یہ بات انھوں نے قصبے کی حویلی میں بیٹھ کر کہی تھی۔

اونکار نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ موٹرسائیکل پر بیٹھ کر دیہات جا کر ٹریکٹر لایا... اپنے ساتھ چار پٹھے لیے... راج مستریوں کے محلے میں جا کر بندو معمار کے چاروں نوجوان لونڈوں کو بٹھایا

... ٹریکٹر پر گاؤں سے بیس کسان پکڑ کر بٹھا لایا تھا... بھٹے کے مالک لالہ ویریندر کو جگا کر ان کے بھٹے پر لے گیا... ٹریکٹر کی ٹرالی میں بھٹے کی اینٹوں کے چار چکر لگوائے... اتنی دیر میں نیویں کھودی جا چکی تھیں... مٹی کا گارا بن چکا تھا... پو پھٹتے پھٹتے دیواریں اتنی اونچی اٹھ گئیں کہ گاؤں کے کسان ایک دوسرے کو گھوڑا بنا کر ان پر چڑھ کر دیوار پر بیٹھے معماروں کو گاروں کے پرات اور اینٹیں پکڑا رہے تھے... حویلی سے رات ہی رات کچھ پرانے کواڑ قبضوں سمیت نکلوا کر نئے پلاٹ کی بے چھت کی عمارت میں نصب کرائے... جب اڈے کی مسجد کا بڈھا ملا اذان دے رہا تھا تو اس وقت نئی عمارت کے اندر فرش چورس کر کے اینٹیں بچھائی جا چکی تھیں۔ جب صبح ہوئی تو امبیڈکر جینتی والوں نے منھ پھاڑ پھاڑ کر سر پر ہاتھ رکھ کر اس عمارت کو دیکھا تھا... او نکار نے بھور بھئے مجھے جگا کر کسانوں کی شراب اور معماروں کے جوڑے کے پیسے لیے تھے...

"تو نے بڑکی کو کیوں بگاڑا مور کھ؟ اپنا ہی گاؤں محلہ ملا تھا تجھے؟" یہ کہہ کر نمبردار نے ایک کرارا طمانچہ او نکار کے منھ پر مارا اور دیکھا کہ ان کی موٹی موٹی انگلیاں اس کے سرخ گالوں پر واضح طور سے ابھر آئی ہیں... وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا...

"دور ہو جا میرے سامنے سے..." وہ چلا گیا تھا۔ انھوں نے سنا تھا وہ دروازے سے نکلتے وقت کھسیایا ہوا تھا، مگر اس کے منھ سے دھیمی دھیمی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔ اس کے اس طرح شرمندہ ہونے اور بڑے جرم کی چھوٹی سزا ملنے کی خوشی اور ہنسی پر انھیں روٹھا روٹھا پیار آیا تھا...

انھوں نے آسمان کی طرف پھر دیکھا اور واپس آتے ہوئے سوچا کہ او نکار اب کہاں ہے۔ وہ تو ان بادلوں کے پرے جا چکا ہے، یا ہو سکتا ہے ابھی تک اس کی آتما نہر کے کنارے جھاڑیوں میں بھٹک رہی ہو۔ انھیں اپنے سینے میں ایک بھاری دھسک محسوس ہوئی۔ انھوں نے اس بے چینی کے عالم میں آنکھیں بند کر کے سوچا کہ یہ سیاست، دولت، اقتدار، پرتاپ کے بس کی بات نہیں۔ وہ تو میری زندگی میں ہی ان چیزوں کی حفاظت مشکل سے کر پائے گا۔ اس سوچ نے ان کی بے چینی کو اور گہرا کر دیا۔

برابر میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے او نکار کھڑا تھا — وہ سیاہ رنگ کا تھا، اس کی لمبی سی تھوتھنی تھی اور موٹے موٹے آدھے چندرما کے آکار کے سینگ

تھے۔ وہ اٹھے اور نیلے کی گردن سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے...

ان کے رونے کی آوازیں سن کر بھرے کے نوکر بھاگے ہوئے ان کے پاس آئے جنھیں گالیاں دے کر پھر ان کی جگہ بھیج دیا گیا۔ ٹھاکر اودل سنگھ کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ اونکار کا قتل کس نے کیا۔ اس کا قتل چھٹکی کے پتی نے کیا تو چھٹکی کے پتی کو کس نے مارا؟ پھر بڑکی کو دھتورا کھلا کر کس نے ختم کیا؟ بڑکی کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی عزت کس نے لوٹی تھی۔ بھیکو کے لونڈے کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ انھوں نے تھانہ انچارج سے بھی گھنٹوں ان معاملات پر گفتگو کی تھی۔ تھانہ انچارج یہی کہتا تھا کہ اونکار کا قتل انھیں مقتولین میں سے کسی نے کیا ہوگا، لیکن اب ملزم کی پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے چھٹکی کو ہی چارج شیٹ کرنا مناسب ہے، کیوں کہ کیس چاروں طرف سے چوکس بیٹھ رہا ہے۔ وہ دیر تک تانے بانے سلجھاتے رہے مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا... نیلا زمین پر بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا تھا...

❖

جب دھرتی پر ہل چلتا ہے تو اس کے سینے پر ایک گہری مانگ پڑ جاتی ہے لیکن ہل کے دوسرے ہی پھیرے میں اس مانگ میں مٹی بھر جاتی ہے۔ زندگی کے زخموں کو وقت بھی اسی طرح بھرتا رہتا ہے۔ شب و روز کا ہل چلتا رہتا ہے اور دکھوں کی گہری لکیریں معاملات کی مٹی سے بھرتی رہتی ہیں۔ یہ انتظام نہ ہو تو زندگی کے کھیت میں فصلیں اگنا ہی بند ہو جائیں... چیئرمینی کے اگلے الیکشن کی تیاری میں ٹھاکر اودل سنگھ کا دکھ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ عدالت نے عینی شاہد نہ ہونے کی وجہ سے چھٹکی کو رہا کر دیا تھا۔ اب وہ چھوٹ کر اپنے پرانے جھونپڑے میں لیپ پوت کر رہنے لگی تھی۔ بھیکو کا بیٹا تین سال پاگل خانے میں رہ کر آ گیا تھا۔ اس نے کھیتی کا کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کھیتوں کے پار میدانوں میں نہر کے پاس چدری چدری بیلوں کے سائے میں جوانسے کی سبز اور کانٹے دار جھاڑیوں میں بیٹھا ایک ٹک آسمان کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کی

بہت خدمت کی مگر اب وہ مایوس ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی بھیکو کے بیٹے سے کوئی سوال کرتی، بھیکو کے بیٹے پر دورہ پڑ جاتا اور وہ ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقلیں کرتے کرتے بے حال ہو جاتا۔ بیوی وقت بے وقت کھیتوں کی طرف نکل جاتی اور اندھیرا ہونے کے بعد واپس آتی، تب بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

ٹھاکر اودل سنگھ ایک بار پھر الیکشن جیت گئے۔ جیت والی رات حویلی میں جشن منایا گیا۔ نمبردار اودل سنگھ نے مٹھی بھر بادام نیلے کے منہ میں ڈالے جنھیں وہ مزے لے لے کر چباتا رہا۔ اچانک انھیں اونکار یاد آیا۔ انھوں نے ایک مٹھی بادام اس کے منہ میں اور ڈالے۔ دو مٹھی باداموں کا اثر تیسرے دن ظاہر ہوا۔ رات کو وہ حویلی کے پھاٹک سے نکلا، سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں اس نے کچھ سال پہلے گائے بھری ہونے کا سہانا منظر دیکھا تھا۔ طویلے میں خاک اڑ رہی تھی۔ وہ کھڑا اپنے پاؤں پٹختا رہا۔ برابر میں کانجی ہاؤس تھا۔ کانجی ہاؤس کے بوسیدہ ٹین کے دروازے کی جھری سے اس نے دیکھا کہ اندر کچھ مریل بکریاں اور دو چار گائیں، بیل اور بچار کھڑے ہیں۔ سینگوں کی ایک ہی ٹکر سے اس نے ٹین کا دروازہ توڑ دیا۔ سارے مویشی کانجی ہاؤس سے نکل کر جہاں سینگ سمایا بھاگ لیے۔ تھوڑی دور پر بھینسوں کا طویلہ تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے بھینسوں کو اپنے سینگوں سے ریلنا شروع کر دیا۔ بھینسیں رسیاں تڑا تڑا کر بھاگیں اور قصبے کی سرحد کے پاس کھیتوں میں گھس گئیں۔ نیلا ادھر سے فارغ ہوا تو پینٹھ جانے والے راستے پر جو گھر ملے ان کے اندر گھس کر سوتے ہوئے آدمیوں کو چارپائیوں پر ہی کھوند ڈالا۔ پکار مچی تو محلّے کے لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ کچھ زخمیوں کی مرہم پٹی کرانے اسپتال لے گئے۔ باقی لاٹھیاں لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑے جس نے یہ سب کیا تھا... نیلے نے آدمیوں کی پکار سنی تو اندھیرے میں ہی اس نے راستہ کاٹا اور بیریوں میں ہوتا ہوا کھیتوں میں اترا اور کھیتوں کھیتوں ہوتا ہوا کہیں گم ہو گیا...

ٹھاکر صاحب کی حویلی پر بہت ہجوم تھا۔ ٹھاکر صاحب نے محسوس کیا کہ اس ہجوم میں سارے لوگ ان کے مخالف نہیں ہیں۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ قصبے کے اکثر لوگ ٹھاکر صاحب کو پسند کرتے تھے، کہ ٹھاکر صاحب جا بے جا معاملے میں اکثر ان کا ساتھ بھی دیتے تھے۔ لیکن نیلے کے سالہا سال کے ہنگاموں اور بربادیوں سے تنگ آ کر وہ ہم نوا لوگ بھی ٹھاکر صاحب سے تو نہیں لیکن

نیلے سے ضرور نفرت کرنے لگے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے مجھے کو یقین دلایا کہ وہ آج ہی اس کا انتظام کریں گے اور اس سلسلے میں میونسپل بورڈ کے آفس میں ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی گئی۔

آفس کھچا کھچ بھرا تھا۔ سارے ممبران حاضر تھے۔ محمود صاحب پرانی چوٹیں بھولے نہیں تھے۔ آج پھر ایک موقع تھا۔ اس دفعہ انھوں نے اچھی تیاری کی تھی۔ رات ہی رات خفیہ طور پر وہ ضلع کلکٹر سے بھی بات کر آئے تھے۔

میٹنگ بہت شور شرابے میں شروع ہوئی تھی۔ مخالف ممبران اُدھم مچانے میں پیش پیش تھے۔

محمود صاحب نے سارے ممبران کے چہروں کا جائزہ لیا اور اندازہ کیا کہ ٹھاکر صاحب کے مواقف ممبران بھی آج کم سے کم نیلے کے معاملے میں تقریباً ہم نوا ہیں... اس احساس نے ان کے اندر ایک نئی طاقت بھر دی۔

"بھائیو! میں پہلے بھی ٹھاکر صاحب کو کئی بار اس وحشی جانور کے سلسلے میں آگاہ کر چکا ہوں بلکہ میں نے تو اسی وقت منع کیا تھا جب انھوں نے اسے پالنا شروع کیا تھا۔ مگر یہ میری بات نہیں مانے۔ انھوں نے اسے بادام کھلا کھلا کر پاگل سانڈ بنا دیا ہے۔ شہری انسانوں کا اس طرح کے جانور پالنے کا شوق غیر فطری ہے۔ اس نیلے نے فصلیں برباد کی ہیں، غریبوں کے گھروں کے برتن اور چولھے توڑے ہیں، ننھے ننھے بچوں کو کچلا ہے، بوڑھے آدمی کا خون کیا ہے، طویلے کی بھینسوں کو مار مار کر بھگایا ہے، کانجی ہاؤس کے مویشیوں کو آزاد کیا ہے۔ ماؤں بہنوں کی... ماؤں بہنوں کی..." (انھوں نے الیکشن کی تقریر پر دل ہی دل میں لعنت بھیجی اور ایک مناسب جملہ ڈھونڈا۔) "ماؤں بہنوں کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ کون ہے جو آج اس قصبے میں چین کی نیند ہو سکتا ہے؟ بولیے، کون ہے؟"

"کوئی نہیں... کوئی نہیں..." ممبران نے جوش و خروش کے ساتھ جواب دیا۔ "نہیں، ایک شخص ہے جو آرام سے سوتا ہے اور چین سے آرام کرتا ہے..." یہ کہہ کر انھوں نے اس جملہ کا تاثر جاننے کے لیے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھیں سوال تھیں۔

"وہ شخص ہے ٹھاکر اودل سنگھ... جو ہمارے چیئرمین ہیں۔"

"ٹھاکر اودل سنگھ، مردہ باد!" ممبران چلّائے۔

"انھیں اس بات کی پروا نہیں کہ اس نیلے نے کتنے نقصانات کیے ___ مالی اور جسمانی اور جانی..." محمود صاحب خاطر خواہ اثر دیکھ کر آگے بڑھے۔

ٹھاکر اودل سنگھ دل ہی دل میں تاؤ کھاتے رہے۔ آخر میں انھوں نے کڑے دل سے ایک فیصلہ کیا اور پوچھا:

"میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

محمود صاحب نے جواب دیا، "ہم چاہتے ہیں کہ قصبے کو اس آفت سے نجات دلائی جائے۔"

"مگر کیسے؟" ٹھاکر صاحب انھیں اپنی راہ پر لانا چاہتے تھے۔

"جان سے ختم کر کے، اَور کیسے؟" محمود صاحب گرجے۔

ٹھاکر صاحب یہی سننا چاہتے تھے۔

"ٹھیک ہے،" ٹھاکر صاحب نے نرمی لیکن مضبوطی سے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ یہ گئوہتیا ہو گی۔"

محمود صاحب نے اندازہ کیا کہ کچھ ممبران یہ بات سن کر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

"دوسری بات یہ کہ قانون مجریہ ۱۹۷۲ کے تحت اسے مارا نہیں جا سکتا۔ اس کی سخت سزا ہے،" ٹھاکر صاحب نے تھانہ انچارج کی گفتگو یاد کر کے یہ جملہ بولا۔

جب انھوں نے اندازہ کر لیا کہ اب ممبران راہ راست پر آ گئے ہیں تو انھوں نے کہا، "کیا آپ لوگ قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی رات کو جو کچھ ہوا وہ سب نیلے نے ہی کیا ہے اور کانجی ہاؤس کے بیلوں، طویلے کی بھینسوں نے کچھ نہیں کیا؟ نیلا بدنام ہو گیا تو کیا سارے الزامات اسی کے سر جائیں گے؟ بد بھلا بدنام برا..." انھوں نے محاورے کا سہارا لیا۔

"لیکن وہ بیل اور بھینس بھی تو نیلے کی وجہ سے ہی مشتعل ہوئے..." محمود صاحب نے دور کی کوڑی لی۔

"تو کیا مشتعل کرنے والا ہی سارا مجرم ہے؟ اشتعال میں آنے والا بالکل معصوم ہے؟" ٹھاکر صاحب گرجے۔ پھر انھوں نے ایک وکیل ممبر سے کہا:

"وکیل صاحب آپ بتایئے، مشتعل ہونے والے اور مشتعل کرنے والے کی سزائیں کیا مختلف ہیں؟"

ممبر وکیل صاحب کیوں کہ ٹھاکر صاحب کی پارٹی کے آدمی تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وکیل بھی تھے اور پیشے کی لاج رکھنا بھی ضروری تھی، اس لیے ان کا جواب بہت مدلل اور ٹھوس تھا۔

"دراصل اشتعال میں آنا ایک ایسا فعل ہے جس کی جڑیں انسانی لاشعور میں دور تک پیوست ہوتی ہیں۔ اگر لاشعور کا وہ حصہ ذرہ برابر بھی مجرمانہ مادّہ رکھتا ہے تو اشتعال میں آنے کے لیے ایک ہلکی سی تحریک بھی کافی ہوتی ہے۔ لیکن مشتعل کرنے والے کو بھی بے قصور نہیں کہہ سکتے، اور سچ پوچھیے تو قصوروار بھی اس اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اس امر کی تحقیق نہ ہو جائے کہ مشتعل کرنے والے نے مشتعل ہونے والے کے ساتھ وہ کون سا فعل کیا جس کی وجہ سے مشتعل ہونے والا مشتعل ہوا۔ معاملۂ ہذا میں نیلے نے صرف اتنا کیا کہ کانجی ہاؤس کے دروازے سے اپنی پیٹھ رگڑی کیوں کہ جانوروں کو پیٹھ رگڑنے کی عادت ہوتی ہے۔ تو اس دھمک سے پرانا دروازہ ٹوٹ گیا اور دوسرے جانور جو موقعے کا انتظار کرتے رہتے ہیں، آزاد ہو گئے، اور پھر انھوں نے من مانی کی۔ کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نیلے نے ان کو ترغیب دے کر فصلیں برباد کرائیں۔ لہٰذا یہ امر تحقیق و تفتیش طلب ہے کہ نیلے کا پچھلی رات کی بربادی میں ذاتی طور سے کتنا حصہ ہے اور حصہ ہے بھی یا نہیں۔"

اس مدلل تقریر کو ابھی ممبران سن کر ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ ٹھاکر صاحب نے ایک حسبِ منشا فیصلہ سنا دیا۔

"بھائیو! نیلے کو تلاش کرنے کی مہم ابھی سے شروع کی جاتی ہے۔ میں تھانے میں بھی بات کروں گا۔ کچھ رضاکارانہ ٹکڑیاں بھی بننا ضروری ہیں کہ ہر کام میونسپل بورڈ نہیں کر سکتا۔ نیلے کو گرفت میں لے کر اس بات کا اندازہ کیا جائے گا کہ آگے کیا کارروائی ہو۔ آج کی میٹنگ برخاست۔"

محمود صاحب نے آج کی میٹنگ کے فیصلے کو اپنی کامیابی سمجھا۔ انھوں نے اپنے ممبروں اور موافقین کے ذریعے قصبے بھر میں یہ شہرت کرا دی کہ نیلا پاگل ہو گیا ہے اور اسے انسانی خون کی

چاٹ لگ گئی ہے۔

جس نے بھی سنا دہشت زدہ رہ گیا۔ دہشت کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نیلا چھپا ہوا تھا اور چھپی ہوئی چیز عیاں چیز کے مقابلے میں زیادہ خطرناک محسوس ہوتی ہے۔ لوگوں نے دیواروں پر نیلے کو پکڑلانے پر انعام دینے کے اشتہار لگادیے۔ نیلے کو پکڑنے کی تیاریاں زوروشور سے ہونے لگیں۔

ضلع کلکٹر نے، جو صبح ہی اپنا نمائندہ بھیج کر ٹھاکر صاحب کو تنبیہ کر چکا تھا، شام کو ٹھاکر صاحب کو ضلع آفس میں بلایا۔ ٹھاکر صاحب بادل ناخواستہ پہنچے، حالاں کہ اندر ہی اندر خوش بھی تھے کہ آج کلکٹر سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔ شہر میں کلکٹر کے آفس میں داخل ہوے تو وہ بڑی سی میز کے پیچھے سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے ٹھاکر صاحب سے پوچھا:

"اودل سنگھ جی! نیلے نے بہت تباہیاں مچا رکھی ہیں۔ روزانہ کوئی نہ کوئی شکایت آجاتی ہے۔ اب اس کا انتظام کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟ میرے اوپر راے عامہ کا بہت زبردست دباؤ ہے۔ دوسرے قصبے والے بھی شکایت کر رہے ہیں کہ ٹھاکر کے نیلے کی وجہ سے گاؤں اور قصبے میں بہت بربادی ہو رہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ کبھی کبھی دوسرے قصبوں اور خود شہر میں بھی آجاتا ہے..."

ٹھاکر اودل سنگھ خاموش رہے۔

"سنا ہے آپ کہتے ہیں کہ اس کو اگر مار دیا جائے تو لوگ گئوہتیا سمجھ کر جذباتی ہو جائیں گے؟ مجھے آپ سے ایسی بچکانہ باتوں کی امید نہیں تھی۔ ہم سب کو پڑھے لکھوں جیسی بات کرنا چاہیے..."

ٹھاکر صاحب بولے، "پڑھے لکھوں کے سامنے پڑھے لکھوں جیسی باتیں ہوتی ہیں۔ دیہات اور قصبے میں لوگ ان پڑھ ہیں۔ انھیں آپ سے زیادہ میں جانتا ہوں۔"

"پھر بھی،" کلکٹر بولا، "پھر بھی میں اسے صحیح نہیں مانتا کہ بربادی پھیلانے والے ایک وحشی جانور کو، جسے آپ نے پال رکھا ہے، صرف اس وجہ سے نہیں مروایا جا سکتا کہ ان پڑھ اسے گئوہتیا سمجھیں گے یا دھرم کا اپمان سمجھیں گے۔"

ٹھاکر صاحب نے ایک اور پینترا اچلا۔

"اصل میں بات یہ ہے صاحب کہ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ نیلے کو مارنا قانون مجریہ ۱۹۷۲ کے تحت جرم ہے۔"

"مگر اس کا علاج ہے،" کلکٹر بولے۔ "میں فارسٹ آفیسر سے بات کر کے چیف وائلڈ لائف آفیسر سے اسے پاگل ڈکلیر کرا کے مروا سکتا ہوں۔"

"مگر یہ تو زیادتی ہوگی۔ نیلا پاگل تو نہیں ہے۔"

"لیکن حرکتیں تو پاگلوں والی ہی کر رہا ہے۔"

"میں اس کا علاج کر رہا ہوں صاحب! آج ہی سے نیلے کو پکڑوانے کی تیاریاں کر لی ہیں۔ آپ مجھے ایک موقع دیجیے۔"

کلکٹر نے بادل ناخواستہ انھیں موقع دے دیا۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب وہ قصبے میں داخل ہوئے تو قصبے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر رکھے تھے اور گلیوں میں پولیس والے ٹہل رہے تھے۔ رضاکار ٹکڑیاں کھیتوں اور جنگلوں میں نیلے کی تلاش میں نکل گئی تھیں۔

ٹکڑی نمبر ۱ نے بھادوں کی سیاہ رات میں قصبے کے باہر والے بیر کے باغ اور کھیتوں کی پگڈنڈی پر کسی کو کھڑا دیکھا۔ اشارے سے بتایا۔ سب لوگ خاموش ہو گئے۔ لاٹھیاں مضبوطی سے پکڑے پکڑے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے اور بیس گز دور سے اس پر ٹارچ پھینکی۔ تین سیل کی ٹارچ کی روشنی میں دیکھا گیا کہ نیلا دھند لکے میں کھڑا ہے۔ ٹارچ فوراً بند کر لی گئی۔ اس ٹکڑی میں پانچ لوگ تھے۔ قریشیوں کا لونڈا یعقوب، جو ایک ہی سانس میں کبڈی ٹیم کے کسی تگڑے پٹھے کو چھو کر سامنے والی لکیر پر ہاتھ مار کر آ جاتا تھا، آج ہاتھ میں موٹی سی لاٹھی سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کا پڑوسی منشی فضائی کا بڑا بیٹا ہاتھ میں اسٹک لیے ہوئے تھا۔ وہ قصبے کے انٹر کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا۔ اسی محلے کے شیخ جلی سمیع انوار کے ہاتھ میں تین سیل کی جیب ٹارچ تھی۔ وہ خود کو ٹکڑی نمبر ۱ کا لیڈر تصور کیے ہوئے تھا۔ ان کے پیچھے شکر والوں کا لونڈا گلشن والی بال تھا جو والی بال کھیلتے ہوئے اتنا اونچا اُچھل کر والی مارتا تھا کہ کبھی کبھی جال کے دوسری طرف مخالف ٹیم کے پھالے میں جا گرتا تھا۔ پانچویں تھے بوڑھے نتھو چچا جو اپنی جوانی میں خرگوش اور تیتر میدان میں

دوڑا کر، تھکا کر زمین پر بٹھا لیتے تھے اور ان کے چاروں طرف چکر لگا کر لحہ بہ لحہ قریب ہوتے ہوتے اچانک ڈھیلے یا ڈنڈے سے خرگوش یا تیتر کو زخمی کر کے پکڑ لیتے تھے۔ یہ ٹیم ہر لحاظ سے نیلے کو قابو میں کرنے کے لیے آئیڈیل تھی۔

نتھو چچا نے اشارے سے سب کو کچھ دیر خاموش رہنے کو کہا تاکہ نیلا ان کی طرف سے بے گمان ہو جائے اور پھر آہستہ آہستہ گھیرا ڈال کر اسے لاٹھی اور اسٹک کی مدد سے قابو میں کر لیں۔ بوڑھے نتھو چچا کے ان خاموش مشوروں سے سمیع انوار کو اپنی تین سیل کی ٹارچ اور لیڈری کی بے عزتی محسوس ہوئی۔ اس نے نتھو چچا کو پیچھے دھکیل کر باقی لوگوں کو اشارے سے پلان سمجھایا کہ اب نیلے کو موقع مت دو۔ چاروں طرف سے گھیر کر ایک دم بلا بول دو۔ منصوبے پر عمل ہوا۔ نیلے کو چاروں طرف سے خاموشی سے گھیر کر ایک ساتھ حملہ ہوا۔ لاٹھی اور اسٹک اُچٹ کر مارنے والوں کے ہاتھوں سے ٹکرا کر فضا میں لہرانے لگیں۔

وہ بیری کا ایک موٹا درخت تھا۔

ٹکڑی نمبر ۲ نے آموں کے باغوں میں نیلے کو ڈھونڈنے کا پلان بنایا تھا۔ آموں کے گھنے باغ میں جیسے ہی سب لوگ داخل ہوئے تو باغ کے اندر بیچ بیچ کرتا ہوا کوئی بھاگا۔ بارش سے باغ میں کیچڑ ہو گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں سب نے واضح طور پر دیکھا کہ وہ نیلا ہی تھا۔ مگر وہ ایک بھورا پٹھا تھا جس کے ابھی سینگ بھی پوری طرح نہیں نکلے تھے۔

ٹکڑی نمبر ۳ نے قصبے کی مشرقی سرحد کے کھنڈروں میں تلاش کا بیڑا اٹھایا۔ کھنڈر میں داخل ہوتے ہی سب نے محسوس کیا کہ کھنڈر میں کوئی ذی روح ہے۔ سب کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ ہمت کر کے آگے بڑھے۔ ملبے پر چڑھ کر کھنڈر کے آخری سرے تک دیکھا تو وہاں ایک سایہ نظر آیا۔ اگر ٹارچ کی روشنی وہیں سے ڈال دی تو وہ بھاگ سکتا ہے، یہ سوچ کر لوگ خاموشی سے ملبے کے نیچے اتر آئے اور پورا چکر کاٹ کر دھیمے دھیمے اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پہنچ گئے جس کی آڑ میں نیلا کھڑا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ٹوٹی ہوئی دیوار سے ہاتھ نکال کر ٹارچ جلائی۔ وہ رام دین تیلی کی دیوی کے نام پر چھوڑی ہوئی بوڑھی گائے تھی۔

البتہ ٹکڑی نمبر ۴ نے جب بڑے پوکھر کے کنارے کی جھاڑیوں میں کھڑے نیلے کو چاروں

طرف سے گھیر کر لاٹھیوں سے اچھی طرح پیٹ کر زمین پر لٹا دیا، اور روشنی میں اس کی چوٹوں کا جائزہ لینے کے لیے جب لالٹین جلائی تو معلوم ہوا وہ لڈن ٹانگے والے کا لنگڑا گھوڑا تھا جو اب اپنے لنگڑے پن کی معذوری سے چھٹکارا پانے کی منزل کے بہت پاس پہنچ چکا تھا۔

البتہ قصبے کے اندر پولیس والوں نے نیلے کے دھوکے میں جن پالتو جانوروں کو مارا اس میں اُن کا، یعنی پولیس والوں کا، کوئی قصور نہیں تھا کیوں کہ ان پالتو جانوروں اور نیلے میں بہت چیزیں مشترک تھیں۔ مثلاً بقاتی کی بھینس اس لیے ماری گئی کہ اس کا قد نیلے کے قد سے ملتا جلتا تھا۔ جمن ٹال والے کا بیل اس لیے زد میں آیا کہ اس کی اونچائی نیلے کی اونچائی کے برابر تھی۔ گنگا تیلی کا بھینسا اس لیے نشانہ بنا کہ اس میں اور نیلے میں یہ قدر مشترک تھی کہ دونوں کے دو دو کان تھے۔

ٹھاکر اودل سنگھ اتنی سرگرمی کے ساتھ نیلے کی تلاش کی مہم کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ وہ حویلی میں آئے۔ جیپ میں بیٹھ کر سیدھے دیہات پہنچے اور گڑھی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ انھیں نیلا بہت یاد آ رہا تھا۔ گڑھی میں پہنچ کر انھیں خاص طور سے نیلے کی ساری باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ آنگن میں پڑی چارپائی پر لیٹ کر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انھوں نے سوتے جاگتے کی کیفیت میں دیکھا کہ نیلا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے اور ان کا ہاتھ چاٹ رہا ہے۔ آہٹ پر آنکھیں کھول دیں۔ وہ خواب نہیں تھا۔ نیلا واقعی ان کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے سینگ اور کھُر پر تازہ لہو کے نشان تھے۔ انھوں نے گھبرا کر معائنہ کیا کہ خون دوسروں کا ہے یا نیلے کے بدن سے نکلا ہے۔ ٹارچ سے دیکھ کر انھوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا۔ خون دوسروں کا ہی تھا۔

❖

نیلا وقت اس گڑھی میں تھا۔ حالاں کہ در حقیقت وہ اس وقت قصبے میں تھا۔ وہ آموں اور امرودوں اور بیروں اور جامنوں کے ہر باغ میں تھا۔ قصبے کا ہر فرد سمجھ رہا تھا کہ نیلا کہیں اور نہیں خود اس کے

دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ بس ذرا دروازہ کھلا اور...

❖

نمبردار اودل سنگھ فیصلہ لینے میں دیر نہیں کرتے تھے، البتہ فیصلہ سنانے میں عجلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ کرنا اور فیصلہ سنانا دو مختلف عمل ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے میں الجھانا مناسب بات نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ جلد لینا عقل مندوں کا شیوہ ہے لیکن فیصلہ ظاہر کرنے میں جلدی کرنا احمقوں کا کام ہے۔ انھوں نے نیلے کے انجام سے متعلق آخری فیصلہ تو نہیں لیا لیکن اتنا ضروری سوچ لیا کہ فی الوقت کیا کرنا چاہیے۔ نیلے کے بارے میں آخری فیصلہ لینے کے لیے انھوں نے اپنے آپ سے وقت مانگا، جو انھوں نے اپنے آپ کو فوراً دے دیا۔ وہ لوگوں کا ردعمل جاننا چاہتے تھے، کہ گڑھی کے باہر گاؤں والے، ہریجن، اسکول کا ہیڈ ماسٹر اور مندر کا پجاری نیلے کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ انھیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ قصبے میں حویلی والے اور حویلی کے باہر دیگر افراد نیلے سے کس حد تک بدظن ہیں اور کس حد تک خائف ہیں؛ میونسپل بورڈ کے موافق اور مخالف ممبران کے جوش کا اب کیا حال ہے۔ ضلع کلکٹر شہر میں بیٹھا کن خطوط پر سوچ رہا ہے، اس بات کی فکر کی آنچ بھی ان کے ذہن کے کسی اجاڑ گوشے میں دھیمے دھیمے سلگ رہی تھی۔

نیلے کے انجام کے بارے میں وہ آخری فیصلہ لے سکتے تھے، لیکن انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ فیصلہ نہیں لیں گے؛ پہلے اس معاملے کے ہر پہلو کا باریکی اور گہرائی سے جائزہ لیں گے۔ لیکن باریکی اور گہرائی سے جائزہ لینے کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ نیلے کو کسی غیر نے دیکھ لیا تو وقت ملنا مشکل ہو جائے گا۔ تبھی انھوں نے ایک فیصلہ کیا۔

بڑے کی کھڑکی کے پاس جا کر آواز دی۔

"پرتاپ... او پرتاپ... باہر آؤ بیٹا!"

ان کی آواز سن کر اندر کمرے میں اچانک چوڑیاں کھنکیں۔ وہ کھڑکی سے دور ہٹ آئے۔ تھوڑی دیر بعد پرتاپ باہر آ گیا۔

"نیلا ہماری گڑھی میں آ گیا ہے،" انھوں نے بغیر کسی جذبے کے یہ جملہ ادا کیا۔ دوسروں کا ردعمل جاننے کی ابتدا وہ گھر سے ہی کرنا چاہتے تھے۔ پرتاپ کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بنیادی طور سے اچھا آدمی تھا۔

"باپو! اب اس کا گزارا یہاں نہیں ہو گا۔ گاؤں والے، قصبے والے، یہاں تک کہ شہر کا کلکٹر بھی، سب کے سب اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی غلط بھی نہیں ہے۔ اس نے بہت تباہی مچا رکھی ہے،" پرتاپ نے گڑھی کے آنگن میں اندھیرے میں کھڑے نیلے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ بات کہی۔

"لیکن یہ ہمارے کتنے کام آیا ہے اور ابھی بھی کتنے کام آ سکتا ہے،" نمبردار نے اس کی طویل گفتگو کا مختصر سا جواب اس انداز سے دیا کہ ان کا جواب ایک سوال بن کر پرتاپ کی آنکھوں کے سامنے آنکڑا سا بن کر ناچنے لگا۔

"وہ سوچ سوچ کر رک رک کر بولا:

"باپو... یہ گڑھی اور حویلی کی حفاظت کرتا ہے تاکہ ہمارا دھن دولت اور راج بنا رہے... لیکن اتنی بربادی کر دیتا ہے کہ ہمیں اس دھن دولت اور راج کو بھوگنے کا وقت بھی نہیں مل پاتا۔ ہر سمے یہی ذکر سنتے ہیں کہ آج نیلے نے اس کا کھیت اجاڑ دیا... کل نیلے نے اس کا کھلیان بگاڑ دیا... ابھی وہ ننھے بچوں کو کچل کر آیا ہے... اب وہ بڈھے بے قصوروں کو مارنے جا رہا ہے... کبھی اپنے ہی جیسے مویشیوں کو لہولہان کر رہا ہے، کبھی چھوٹی چھوٹی بکریوں پر کھرا اڑا رہا ہے۔ ہمیں اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے اس جنگلی کی مدد نہیں لینا چاہیے۔ ہم خود چوکنا سویا کریں گے..."

"تم مورکھ ہو پرتاپ! اس کا مطلب، تم اس وچار کے آدمی ہو کہ گڑھی میں یا حویلی میں پہلے چور کو آنے کی چھوٹ دے دو۔ جب وہ آ جائے تو چونک کر اسے پکڑ لو۔ ارے مورکھ! کوشش یہ ہونا چاہیے، اور یہی کوشش میں نے کی تھی، کہ ایسا نقشہ بن جائے کہ کوئی گڑھی اور حویلی میں گھسنے کا خیال بھی من میں نہ لائے۔"

پرتاپ چپ ہو گیا- وہ زیادہ دیر تک اپنے باپ سے بحث نہیں کر پاتا تھا- "میں نے سوچا ہے..." انھوں نے پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا، اور وہ جانتے تھے کہ جب وہ پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کوئی بات کہتے ہیں تو وہ ہم نوائی کرنے لگتا ہے، "نیلے کو کچھ دن کے لیے مندر والے ارہر کے گھنے کھیت میں چھپا دیتے ہیں- پھر اندازہ کرتے ہیں کہ لوگوں کا اس کے بارے میں کیا وچار بن رہا ہے..."

انھوں نے صرف پرتاپ اور گڑھی کے دونوں پہرے دار نوکروں کو اپنا ہم راز بنایا-

کھرا سا ہو گیا تھا- دونوں پہرے دار نیلے کو گڑ اور بادام کھلاتے ہوئے آہستہ آہستہ رات کے پھیلے سناٹے میں گڑھی سے باہر لے گئے- اس کے زخموں پر ہلدی تھوپ دی گئی تھی جس سے بدن کیسریا ہو گیا تھا- تنگ گلیوں سے نکال کر آموں کے باغوں کے برابر سے ہوتے ہوئے مندر والے ارہر کے گھنے کھیت کے پاس پہنچے- ایک اسے لیے کھڑا رہا، دوسرا اندر جا کر کھیت کے بیچوں بیچ پودھے کاٹ کر جگہ بنانے لگا- پھر دھیرے دھیرے نیلے کو کھیت میں داخل کر کے اس جگہ پہنچے- نیلا اس کھیت سے مانوس تھا- اکثر وہاں آیا کرتا تھا- اس نے فی الوقت کوئی مزاحمت نہیں کی- اندر ایک موٹا سا کھونٹا ہاتھ بھر زمین میں گاڑ کر نیلے کی گردن میں رسان کے ساتھ رسّی باندھ دی- رسی لمبی تھی، اتنی لمبی کہ نیلا آسانی سے چل پھر سکتا تھا- دوسرے پھیرے میں بہت سا چارا، بہت سا موٹا ناج اور بہت سا گڑ اور بادام لا کر اس کے پاس رکھ دیے گئے- ناند میں اوپر تک پانی بھر کر ناند وہیں مٹی میں جما دی گئی-

واپسی میں سایوں کی طرح رینگتے ہوئے دونوں پہرے دار گڑھی میں پہنچے اور نمبردار کو نیلے کے اس کچے انتظام کی پکی خبر دی- نمبردار اودل سنگھ نے، جو اتنی دیر سے سانس روکے بیٹھے تھے، ایک بڑی سی اطمینان بھری سانس باہر چھوڑی- "اب تم باہر جا کر اطمینان سے سو جاؤ... بہو سے کچھ نہ کہنا..." انھوں نے ایسے یقین سے کہا گویا شوہر لوگ بیویوں سے راز چھپا پاتے ہوں- ویسے بھی بڑی بہو نے کھڑکی کی اوٹ سے منظر کا آدھا حصہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا-

نمبردار صبح اٹھے تو سب سے پہلے گاؤں کا ایک چکر لگایا- لوگ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی کہ آج بہت دنوں بعد نمبردار کو گاؤں پر ٹوٹ کر پیار آیا ہے، اور وہ بھی ہر گلی پر-

عورتوں نے انھیں دیکھ کر گھونگھٹ کاڑھ لیے اور مردوں نے ان کے پاس اکٹھا ہو کر نیلے کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ "کیا ہوا نمبردار جی، نیلا ملا کہ نہیں؟"

"بھئی کوشش تو جاری ہے۔ ایک ذرا سے جانور کو ڈھونڈنے کے لیے قصبے میں بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں،" انھوں نے گول گول بات کی۔

لیکن ان کی اس گول گول بات میں بھی کچھ لوگوں نے اچھے خاصے چوکور مطلب نکال لیے۔ دراصل "ذرا سے جانور" اور "بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے لوگوں کی کوشش" والا جملہ ـــــ نمبردار اودل سنگھ کا سوچا سمجھا جملہ ـــــ اس بات کا متقاضی تھا کہ لوگ کم از کم ان کے سامنے ہمدردی کا اظہار کریں۔

"کئی دن سے دیکھا نہیں تو کچھ عجیب عجیب سا لگتا ہے،" ان کے ایک پڑوسی نے سنبھل سنبھل کر جملہ بولا۔

لیکن اس جملے سے راستہ کھل گیا تھا۔ ان کے تمام ہم نوا بھیڑ میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ان کی طرف ہو گئے تھے۔

"جانے غریب کو اس بیچ چارا بھی ملا کہ نہیں..." دوسرے نے تاسف بھرے لہجے میں اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"پچھلے کئی مہینوں سے وہ بالکل چپ چاپ ہو گیا تھا... چلتے چلتے رک جاتا تھا..." تیسرے نے انکشاف کیا۔

اس انکشاف پر نمبردار کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے اپنا منھ جلدی سے بند کر لیا اور سوچا ٹھیک ہی کہتا ہو گا۔ دراصل یہ بات سچ بھی تھی۔ نیلا چلتے چلتے رک جاتا تھا اور رک کر اس شخص پر حملہ کرتا تھا جو سب سے نزدیک ہو...

چوتھے نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، "ابھی پندرہ دن پہلے میں کھیت سے ہل چلا کر واپس آ رہا تھا تو دیکھا، نمبردار کا نیلا مندر کے سامنے کھڑا ہے۔ جیسے ہی سورج دیوتا ڈوبے، نمبردار کے نیلے نے مندر کی طرف منھ کر کے ڈنڈوت کی اور دونوں کھُر جوڑ دیے..."

باقی لوگوں کے چہرے پر عقیدت کی روشنی جگمگ جگمگ کرنے لگی۔

ٹھاکر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اندازہ کیا کہ جن جن کے گھروں کے برتن نیلے نے توڑے تھے، جن کے بچوں کو کچلا تھا اور جن جن پر حملہ کیا تھا، وہ ان لوگوں کی ہم نوائی نہیں کر رہے ہیں... خاموشی سے، ایک بے بس خاموش نگاہی سے ایک دوسرے کا منھ تک رہے ہیں...

ان کے ہم نوا ان کے ساتھ چلے۔ باقی لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔ انھوں نے واضح سنا، وہ نمبردار اور نیلے دونوں کو سرگوشیوں میں گالیاں دے رہے تھے۔

راستے میں مندر کے پاس رک کر انھوں نے ہاتھ جوڑے۔ پجاری جی باہر نکل آئے۔ انھوں نے اپنے ساتھ کے لوگوں کو سنانے کے لیے پجاری جی سے پوچھا، "قصبے میں اٹکھیلیاں کر کے نیلا بھاگا تھا، آپ نے ادھر تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں بیٹا..." پھر کچھ رک کر انھوں نے جملے کو آگے بڑھایا، "ہو سکتا ہے، پاپیوں کی بستی سے کچھ دنوں کے لیے کچھ دور چلا گیا ہو۔" نمبردار نے سوچا، ساتھ والے دیہاتی خود کو "پاپی" نہ سمجھیں۔ انھوں نے اپنے جملے میں اس کی وضاحت کر دی۔

"ہاں مہاراج! قصبے والے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ دراصل وہ مجھ سے دشمنی نکالنا چاہتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر چلنے لگے۔

"تو چنتا نہ کر نمبردار، انت میں اچھائی کی برائی پر جیت ہوتی ہے..." پجاری جی نے نمبردار کو چلتے چلتے آشیرواد دیا۔

نمبردار سب کو ساتھ لے کر آگے بڑھ لیے تھے۔ کچھ یاد آیا، رکے اور گھوم کر دیکھا۔ پجاری جی وہیں کھڑے تھے۔ انھیں لگا جیسے پجاری جی کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ساتھ کے آدمیوں کی وجہ سے کچھ سنکوچ میں ہیں۔

نمبردار کو کچھ یاد آیا۔

"ارے مہاراج، ادھر میں بہت کام کاج میں لگا رہا... دھیان نہیں رہا۔ مندر کے گیہوں، گڑ اور کپڑے ابھی نہیں پہنچا پایا ہوں۔ آج ہی شام کو آدمی دے جائے گا۔"

مہاراج نے اطمینان کی سانس لے کر پھر آشیرواد دیا۔ اس بار انھوں نے ہاتھ اٹھا کر بڑا والا آشیرواد دیا تھا۔

بس اس ہیڈماسٹر کے بچے کے خیالات اور معلوم ہو جائیں، انھوں نے امرائی کے پاس کمر جھکے شکستہ اسکول کو دیکھ کر سوچا۔

ہیڈماسٹر سے ان کے تعلقات عجیب نوعیت کے تھے۔ ضلع کلکٹر اور شہر کے پڑھے لکھوں کو دکھانے کے لیے گاؤں میں اسکول ہونا ضروری تھا، اس لیے اسکول تھا۔ اسکول کا خرچہ گرام پنچایت اٹھاتی تھی جس میں ساری بات نمبردار کی چلتی تھی۔ لیکن ہیڈماسٹر نمبردار اودل سنگھ کی جا بے جا خوشامد نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت ایک معقول حرکت نہیں کہی جا سکتی۔ نمبردار کو دیہات کے بچوں کی تعلیم بہت اکھرتی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ سارے لونڈے جنھوں نے اس اسکول میں تعلیم پائی تھی ان سے اتنے خوش نہیں رہتے تھے جتنے وہ لونڈے جنھوں نے تعلیم نہیں پائی تھی۔ انھوں نے خفیہ طریقے سے اس بات کی بھی ٹوہ لگائی تھی کہ کہیں یہ ہیڈماسٹر بچوں کو تعلیم دینے کے بہانے، نمبردار کی برائیاں تو نہیں کرتا۔ اس جاسوسی کے نتیجے میں انھیں براہِ راست مثبت جواب نہیں ملا، البتہ ٹوہ لینے والوں نے نمبردار کو یہ ضرور بتایا تھا کہ آج کل اسکول کی جو کتابیں چھپتی ہیں ان میں خواہ مخواہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر لونڈے لوگوں کو نمبردار کا خیال آ جاتا ہوگا۔ مثلاً مہابھارت کا وہ حصہ کتاب میں ہونا کیا ضروری ہے جس میں کنس کا ذکر بہت نفرت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس طرح رامائن کا پاٹھ راون کے ذکر کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے تاریخ کی کتابوں پر بھی مدلل اعتراضات کیے اور کہا کہ ہیڈماسٹر جان بوجھ کر ان حصوں کو بہت تفصیل کے ساتھ دانت پیس پیس کر پڑھاتا ہے جن حصوں میں ہٹلر، مسولینی وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ ان لوگوں کی نظروں سے معاشیات کی کتابوں کے وہ مخدوش حصے بھی نہیں بچ سکے جن کو پڑھ کر لونڈے خود کو سب کے برابر سمجھنے لگے ہیں۔ ادب کے وہ حصے بھی مناسب نہیں تھے جن میں غریبی سے نفرت اور انقلاب کی ضرورت وغیرہ پر زور دیا گیا تھا...

نمبردار نے نصاب سے متعلق اصلاحات کی ان تجویزوں کو ہیڈماسٹر کے سامنے رکھا تھا۔ ہیڈماسٹر یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ پھر ہنسنے لگا تھا۔ اس کی حیرانی تو کسی حد تک اودل سنگھ کی سمجھ میں آئی تھی مگر اس ہنسی کو انھوں نے بدتمیزی پر محمول کیا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ آپ اس اسکول میں کس کی وجہ سے ہیڈماسٹر ہیں؟ میری وجہ سے،

سمجھے۔" تب ہیڈ ماسٹر نے دھیمی دھیمی آواز میں ان کو بتایا:

"اول تو یہ کہ میں ہیڈ ماسٹر نہیں صرف ماسٹر ہوں، کیوں کہ میرے علاوہ اسکول میں کوئی ماسٹر نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ میں بچوں کو تعلیم دیتا ہوں اور اس کے بدلے میں گرام پنچایت مجھے مہینہ مہینہ یا کبھی تین تین مہینے بعد تنخواہ دیتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اتنی کم تنخواہ میں تین ماسٹروں کا کام اس دیہات میں میرے علاوہ کون کرے گا؟"

نمبردار کو سچائی کے اس قسم کے براہ راست اور بے تکلف اظہار سے بڑی الجھن سی ہوتی تھی۔

"اگر میں گرام پنچایت سے کہلوا کر آپ کو نکلوا دوں تو؟" تو کہنے کے لیے جتنا منھ کھولنا ضروری ہوتا ہے انھوں نے اس سے زیادہ کھولا اور دیر تک کھولے رکھا۔

"تو یہ ہوگا کہ گاؤں میں آپ کی تھو تھو ہوگی اور جب یہ بات قصبے تک پہنچے گی تو اگلے الیکشن میں آپ کے خلاف یہ بھی ایک نکتہ استعمال کیا جائے گا..."

نمبردار نے اپنا بڑا سا کھلا ہوا منھ جلدی سے بند کر لیا۔ کیوں کہ وہاں تک نمبردار اودل سنگھ کی عقل نہیں گئی تھی اس لیے وہ ہیڈ ماسٹر کی اس اطلاع سے نروس ہو گئے تھے۔ تب انھوں نے پینترا بدل کر کہا تھا:

"میں نے تو ہیڈ ماسٹر صاحب، آپ کی گہرائی جاننے کے لیے اتنی باتیں کیں۔ آپ کا رہنا اور یہاں رہ کر بچوں کو تعلیم دینا گاؤں کی شوبھا بڑھاتا ہے۔ بلکہ آپ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ یہ گاؤں آپ اور آپ کے اسکول کے بغیر ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

ہیڈ ماسٹر اپنی چرخ چوں سائیکل پر بیٹھ کر اسکول کی طرف بڑھ گیا تھا۔

انھیں ماسٹر کا ایک جملہ اور یاد آیا۔

"جنگلی جانور کو گڑ بادام کھلا کر اور سرسوں کا تیل پلا کر نمبردار نے اس کی بدھی بھرشٹ کر دی ہے۔ یہ پراکرتی کے خلاف ہے۔"

آج وہ اُسی ہیڈ ماسٹر کے پاس اُسی نیلے کے بارے میں اس کی تازہ رائے جاننے کے لیے نکلے تھے۔

ہیڈ ماسٹر اسکول میں بیٹھا بچوں کو سبق پڑھا رہا تھا۔

نمبردار ایک یاد سے بہت بچتے تھے۔ یاد آتے ہی خود کو ادھر اُدھر بہلا لیتے تھے۔ مگر آج انھیں اس ہیڈ ماسٹر سے وہ عجیب و غریب پراسرار ملاقات پھر یاد آ گئی۔ یہ جب کی بات ہے جب بڑکی کی عزت لوٹی گئی تھی۔ اس پراسرار ملاقات سے کچھ دن پہلے کمہار کی بیوہ اور بڑکی اور چھٹکی نے اسکول کی چھٹی کے بعد اسکول کے باہر نیم کے درخت کے نیچے ماسٹر صاحب کا انتظار کیا تھا۔ جب وہ اسکول بند کر کے وہاں سے گزرے تو کمہارن نے ان کے پاؤں پکڑ کر رو رو کر کہا تھا کہ نمبردار کا نیلا روزانہ ان کے محنت سے بنائے ہوئے برتن توڑ دیتا ہے۔ وہ آج شکایت لے کر ٹھاکر کے پاس گئیں تو ٹھاکر نے ہنس کر ان سے کہا کہ "برتن توڑتا ہے، مٹی تو نہیں کھا جاتا ہے۔ اسی مٹی کو پھر سے گوندھ گاندھ کر برتن بنا لیا کرو۔ اس میں اتنی پریشانی کی کون سی بات ہے جو مجھے کلیسو کے وقت پریشان کر رہی ہو۔"

ہیڈ ماسٹر نے ان تینوں کو ڈھارس دی اور گڑھی میں جا کر نمبردار کو سمجھایا۔ نمبردار نے تو ہنس کے ٹال دیا مگر اونکار کا چہرہ سرخ ہو گیا جو وہیں کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔

گڑھی کے دروازے پر تینوں عورتیں کھڑی ماسٹر کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب ماسٹر بڑے دروازے سے نکل رہا تھا تو اس نے اونکار کو غصے کی حالت میں کمہارن اور اس کی بیٹیوں سے بات کرتے دیکھا۔ وہ ان تینوں کو ننگی ننگی گالیاں دے رہا تھا جن کی آج اتنی ہمت ہو گئی کہ وہ پنچایتی اسکول کے ماسٹر کو ان کے باپ کے پاس نیلے کی شکایت لے کر بھیجیں۔ ماسٹر کو آتا دیکھ کر اس نے نسبتاً شائستہ لہجے میں ان دونوں لونڈیوں کو کپڑے اتارنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا:

"اوپر والے کا شکر کرو کہ ابھی نیلے نے ہی برتن توڑے ہیں۔ میں نے تو ابھی برتنوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" وہ جاہل عورتیں کیا سمجھتیں، مگر ماسٹر کا ماتھا ٹھنک گیا۔ وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

جب بڑکی کا جھونپڑے والا واقعہ ہو گیا تو ایک رات ٹھاکر جیپ میں سوار گاؤں کی گڑھی تک آئے اور اتر کر تھکے تھکے قدموں سے جب گڑھی کے دروازے پر پہنچے تو دھند لکے میں انھیں ایک شخص رضائی اوڑھے کھڑا دکھائی دیا۔ وہ آدمی دھیمے دھیمے رو رہا تھا۔ انھیں اس پراسرار شخص سے ڈر محسوس ہوا۔ وہ پہرے داروں کو آواز دینے ہی والے تھے کہ اس شخص نے رضائی سے منہ نکال لیا۔

اس کی بوڑھی آنکھیں سرخ تھیں اور گیلی تھیں۔ اس نے رندھی رندھی آواز میں ٹھاکر سے کہا،
"نمبردار جی! بڑکی کی عزت معلوم ہے کس نے...؟"
"کس نے؟" ٹھاکر نے مری مری آواز میں پوچھا۔ انھیں اس سوال کے جواب اور ہیڈماسٹر کے اس پراسرار روپ سے ڈر لگ رہا تھا۔
"اس نے.. ادھر دیکھو..." ٹھاکر نے اس کی انگلی کے اشارے پر نظریں دوڑائیں۔ سامنے اندھیرے میں نیلا کھڑا تھا۔ ہیڈماسٹر انھیں حیران دیکھ کر ہنسا تھااور پھر اندھیری گلی میں غائب ہو گیا تھا۔ ٹھاکر نے جلدی سے اس یاد کو اپنے ذہن سے جھٹکا۔ نمبردار اور ان کے ساتھ والوں کو دیکھ کر اس نے جلدی جلدی سبق ختم کرایا، سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور سلام کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا:

"میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چل کر بیٹھیں..."
نمبردار کو اس معمولی گزارش میں ایک طرح کی علامتی قسم کی گستاخی نظر آئی۔
"نہیں نہیں ہیڈماسٹر صاحب... بس بہت دن سے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ سوچا آپ سے سلام دعا کر لیں۔ ہم لوگ ادھر نیلے کی تلاش کر رہے ہیں۔ آپ نے تو نہیں دیکھا؟" نمبردار نے یہ کہہ کر ماسٹر کے چہرے کو گہری نگاہوں سے کریدا اور اپنے ذہن کی داد دی کہ کیسے انھوں نے سمجھ لیا کہ ہیڈماسٹر کے سیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے جانے والے جملے کا مطلب تھا کہ نمبردار بھی اس کی شاگردی اختیار کر کے علم کی بلندیاں چڑھ کر اس کی اونچائی تک پہنچ جائیں۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنی عقل کو داد دی اور ایک بار پھر ہیڈماسٹر کے چہرے کو اپنی نظروں سے کریدا۔ کیوں کہ ہیڈماسٹر کے چہرے پر شیو بڑھا ہوا تھا اس لیے وہ اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی مدد سے زیادہ نہیں کرید پائے۔
"نہیں ادھر تو نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے آپ کو پہلے ہی سمجھایا تھا کہ ایسے وحشی جانور کو اگر پالنا ہی ضروری ہے تو وہی کھان پان دیں جو اسے جنگل میں ملتا ہے اور اسے انسانوں کی صحبت سے دور رکھیں، ورنہ اس کا وہ فطری ڈر ختم ہو جاتا ہے جو ہر جانور کو انسان سے محسوس ہوتا ہے۔"
نمبردار کو اندازہ ہو گیا کہ ہیڈماسٹر کی نیلے کے بارے میں تازہ رائے کیا ہے۔ ہیڈماسٹر کی

تازہ رائے ہیڈ ماسٹر کی باسی رائے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اب نمبردار نے اسے علم کے وار سے گھائل کرنا مناسب سمجھا۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب، میرے بہت سے دوست ہیں، آسام سے لے کر گجرات اور ہمالہ سے لے کر تمل ناڈو تک۔ آسام والے نے قاضی رنگا سے ایک نیلا پکڑ کر پالا، گجرات والے نے گیر کے جنگل سے نیلا لا کر اپنے ساتھ رکھا، ترائی والے دوست نے ودھوا کے جنگل سے نیلا حاصل کیا اور تمل ناڈو والے نے باندی پور کے جنگل سے پکڑ کر اپنا پالتو بنایا۔ مگر آپ کو میرے ہی نیلے میں ساری برائیاں نظر آتی ہیں..."

"نمبردار! آپ سچ سچ بتانا، کیا آپ کے دوستوں نے جو نیلے پالے وہ بڑے ہو کر قیمتی غذائیں کھا کر جنگل میں دوڑنے کی محنت اٹھائے بغیر چارا کھا کر، کیا مست نہیں ہوئے؟ کیا بربادی نہیں مچائی؟"

نمبردار نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ خود اپنے نیلے میں اتنی بری طرح الجھے رہتے تھے کہ انھیں اپنے دوستوں کے نیلوں کا زیادہ دھیان ہی نہیں آتا تھا۔

انھوں نے بات بدلنے کی خاطر پوچھا:

"اچھا تو ماسٹر صاحب، آپ ہی بتاؤ، اب کیا کیا جائے؟"

"پہلے تو آپ نیلا ڈھونڈیے۔ وہ جہاں بھی جائے گا آفت مچائے گا۔ اس کی عادتیں خراب ہو چکی ہیں۔ اسے ڈھونڈ کر اپنے پاس باندھ کر رکھیے، اور آہستہ آہستہ اس کی بُری عادتیں چھڑوائیے۔ اس کی غذا بدلیے۔ اسے پھر سے اس کی فطری غذا پر لائیے۔ حالاں کہ اس میں پریشانی تو ہو گی مگر یہ تو اب کرنا ہی پڑے گا۔ جب وہ اپنی غذا کا عادی ہو جائے تو اس کو میدانوں میں چھوڑ آئیے۔ اس بیچ اس کی چربی بھی کچھ کم ہو چکی ہو گی، اور چربی کم ہونے سے وہ میدان دوڑنے میں تکلیف نہیں محسوس کرے گا۔ میدانوں میں بھاگ دوڑ کر کے جب اسے اپنی جنگل کی غذا ملے گی اور اپنے ساتھی ملیں گے اور مادائیں ملیں گی تو اس کا جنون ختم ہو جائے گا اور پھر اپنی فطری زندگی کا عادی ہو جائے گا..."

"لیکن میری گڑھی اور حویلی کا کیا ہو گا؟" ٹھاکر کے منھ سے نکل پڑا۔

"اس کا کیا مطلب؟"

ٹھاکر کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے منھ سے حماقت کی بات نکل گئی ــــ یعنی صحیح بات نکل گئی۔ فوراً پہلو بدل کر بولے، "مطلب، گڑھی اور حویلی میں اسے دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ وہ نظر نہیں آئے گا تو کتنا برا لگے گا۔"

"نمبردار جی! گڑھی اور حویلی میں اپنے بیٹے اور بہو اور پوتے پوتی اور گاؤں والوں اور قصبے والوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کیجیے، اور انھیں میں اپنی تفریح کا سامان پیدا کیجیے۔ انھیں میں آپ کی زندگی ہے اور انھیں سے آپ کی زندگی ہے۔ بھگوان کے لیے اب اپنا شوق ختم کیجیے۔ آپ کا یہ شوق اس جانور کو بھی بھاری پڑ رہا ہے اور گاؤں اور قصبے والوں کو بھی۔ گڑھی اور حویلی میں بھی بربادی مچی ہوئی ہے۔ آج جا کر آپ من لگا کر سوچیے کہ کیا کارن ہے جس کی وجہ سے آپ کو نیلے کی چاہ ہے۔ جب وہ کارن سمجھ میں آ جائے تو اس کارن کی جڑ کاٹ کر پھینک دیجیے۔"

نمبردار اودل سنگھ جب واپس آئے تو بظاہر وہ اپنے ساتھ والوں سے ہیڈ ماسٹر کی حماقت آمیز باتوں پر ہنس ہنس کر جملے کس رہے تھے، لیکن اندر سے انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جاہل ہیڈ ماسٹر نے ان کی دکھتی نبض پر انگلی رکھ دی ہے۔

گڑھی میں واپس آ کر وہ چھت پر چڑھ گئے اور وہاں انھوں نے دور مندر کے کھیت میں کھڑے نیلے کو محسوس کیا اور اس بات سے مطمئن ہوئے کہ سردیوں کا زمانہ ہے، ورنہ گرمی ہوتی تو نیلا اتنی دیر تک کھیت کی گرمی کی تاب نہ لا پاتا۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے نیلے سے پیدا ہونے والی دہشت کو محسوس کیا اور اس دہشت کے سائے میں قطرہ قطرہ بڑھتی دولت اور انچ انچ بڑھتے اقتدار اور اختیار کا لقمہ لقمہ ہضم کیا، اور جب وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے تو ایک طرف تو ان کا ذہن کہہ رہا تھا کہ نیلے سے چھٹکارا حاصل کر لو اور دوسری طرف کوئی چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے کان لگا کر سنا تو یہ دوسری آواز ان کے سینے کے بائیں طرف سے آئی تھی۔

جب وہ آنگن میں آ کر مونڈھے پر بیٹھے تو چراغ جل چکے تھے۔ باہر سے پہرے دار دوڑتے ہوئے آئے اور انھیں اطلاع دی کہ نیلا ارہر کے کھیت میں سے رسی تڑا کر بھاگ لیا ہے۔

ان کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ قصبے میں پہنچ جائے۔ اب کوئی بربادی ہوئی تو بڑی بدنامی ہو گی۔

وہ جیپ پر بیٹھ کر ہوا کی رفتار سے قصبے کی طرف روانہ ہوئے۔ پرتاپ روکتا ہی رہ گیا۔

قصبے کی گلیوں میں اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی تھی۔ لیکن انسان نہیں تھے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں کنڈی لگائے بیٹھے تھے۔ چوراہوں پر پولیس والے کھڑے سیٹیاں بجا رہے تھے اور آوارہ کتے خلاف معمول اتنی جلد بازار سُونا دیکھ کر منحوس آوازیں رونے لگے تھے۔

نیلا قصبے میں کسی بھی گھر کے پاس کھڑا مل سکتا ہے۔ یا ہو سکتا ہے قصبے کے باہر کھیت یا کسی اجڑے ہوئے باغ میں کھڑا ہو۔ حویلی تک جانے والی سڑک کے ایک موڑ پر جیسے ہی وہ مڑے، انھیں ایک سایہ سا نظر آیا۔ خوف کی ایک ٹھنڈی لہر ان کی گدی سے ہوتی ہوئی پوری پیٹھ پر پھیل گئی۔ یہ نیلے کا ہی سایہ ہو گا، کہ انسان تو سارے اسی کے ڈر سے گھروں میں بند بیٹھے ہیں۔

حویلی کے صحن میں جا کر انھوں نے نیلے کو ہر طرف تلاش کیا۔ وہ کہیں نہیں ملا۔ بجلی چلی گئی تھی اور رات بالکل تاریک تھی۔ وہ بیٹھک میں اکیلے بیٹھے سوچتے رہے اور ڈرتے رہے۔ رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت ان کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک پورے قصبے میں چیخ پکار کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ حویلی کے نوکروں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔

وہ جلدی سے اٹھے اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اندھیرے میں کوئی جانور تیز تیز سانس لیتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں کر پائے کہ وہ کدھر گیا۔ اچانک پھر ایک جانور مخالف سمت سے بھاگتا ہوا آیا اور دوڑتا چلا گیا۔

انھوں نے سامنے کی گلی کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہاں بھی ایک سیاہ سایہ کھڑا تھا۔ انسانوں کا شور اور پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں اب بھی تھمی نہیں تھیں۔ انھوں نے گلی کی طرف پھر دیکھا۔ اب وہ سایہ وہاں نہیں تھا۔

اس رات ایک ساتھ ۱۲ وارداتیں ہوئیں۔ قصبے کے کونے والے محلے کے ایک ہی خاندان کے تین گھروں کے دروازے ٹوٹے ہوئے پائے گئے۔ بزریا کی پانچ دکانوں کے شٹر ٹیڑھے ہو گئے تھے اور اندر کی جنس دو کانوں میں چاروں طرف بکھری ہوئی ملی تھی۔ تین پولیس والوں پر پیچھے سے کسی جانور نے اندھیرے میں حملہ کیا جو بڑے نالے کی پُلیا پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میونسپل بورڈ میٹنگ ہال کا دروازہ توڑ کر پندرہ کرسیوں کو سینٹے کے قلم کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔ جو وارداتیں کچی زمین پر ہوئی تھیں وہاں جانور کے کھُروں کے نشان پائے گئے تھے۔

میونسپل بورڈ کے آفس میں ضلع کلکٹر متفکر بیٹھا تھا۔ ٹھاکر اودل سنگھ اور محمود صاحب اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ قصبے کا دورہ کر کے ایس پی صاحب جیپ سے اترے، ان کے ساتھ ہی قصبہ انچارج کودا۔ ہال میں آ کر ایس پی صاحب ایک کرسی کھینچ کر کلکٹر صاحب کے برابر بیٹھ گئے۔ قصبہ انچارج سامنے آ کر اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

"آرام سے،" ایس پی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ آرام سے ہو گیا۔

"آپ نے نتیجہ دیکھ لیا..." کلکٹر نے خاموشی توڑی۔

نمبردار چپ بیٹھے رہے۔ محمود صاحب نے بھی سر جھکا لیا۔ اودل سنگھ کی بدنامی اور بے عزتی اتنی واضح تھی کہ محمود صاحب کی مزید کمک کی ضرورت نہیں تھی۔

"مگر یہ ساری وارداتیں ایک ہی نیلے کی کارستانی نہیں ہیں،" ایس پی نے انکشاف کیا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ کئی نیلے ہیں؟" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"نہیں، یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن پولیس والوں کا بیان تھا کہ ان پر جو حملہ ہوا اس میں ایک سے زیادہ جانور ملوّث تھے،" ایس پی کے اس جملے سے نمبردار اودل سنگھ کے بدن میں کچھ جان پڑی۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟ کچھ اندازہ؟"

"قصبہ انچارج سے بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ کچھ روز پہلے کانجی ہاؤس سے نیلے نے

جن بجاروں کو آزاد کرایا تھا وہ اس کے ملزم ہو سکتے ہیں۔ کئی دنوں کے بھوکے پیاسے بجار رات کو اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکلے ہوں گے اور پانی پینے نالے پر آئے ہوں گے۔ وہاں سپاہی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ پانی کے حصول میں مزاحم سمجھ کر حملہ بول دیا ہوگا..."

"کیا نیلے اور بجار کے کھُر کے نشان میں فرق محسوس ہو سکتا ہے؟" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں سرکار!" قصبہ انچارج بولا۔ "مگر ہوا اتنی چلی کہ ان کے کھُر آدھے ہیں آدھے غائب۔ اب پہچان مشکل ہے۔"

نیلے کے کھُر کی پہچان والی بات سن کر نمبردار اودل سنگھ نے بازی پلٹتی محسوس کی۔ فوراً بولے، اور کیوں کہ اس بار پہلی مرتبہ بولے تھے اس لیے بات دھیان سے سنی گئی:

"صاحب! بزریا کی دکانیں توڑ کر سامان کون اٹھا لے گیا؟ یہ حرکت جانور نہیں کر سکتا۔"

اس بات کو سن کر ایس پی اور تھانہ انچارج نے سر جھکا لیا۔ تھانہ انچارج کا لمبوترا چہرا اس کے سینے پر ٹک گیا اور دیر تک وہیں ٹکا رہا۔

کلکٹر نے مسوری کی تربیت کے دوران بڑی نادر و نایاب باتیں سیکھی تھیں، اس لیے وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا:

"اصل معاملے سے توجہ نہیں ہٹنا چاہیے۔ جب جڑ کا علاج ہو جائے گا تو باقی باتیں خود بخود درست ہو جائیں گی۔ اس پورے فتنے فساد کی بنیاد ہے دراصل ٹھاکر صاحب کا نیلا، جو اب پاگل ہو چکا ہے۔ اس وقت اسی کے بارے میں گفتگو کرنا چاہیے... اب آپ بتائیے ٹھاکر صاحب کہ آپ کا فیصلہ کیا ہے؟"

"جس میں سب کی بھلائی ہو،" ٹھاکر دل کڑا کر کے بولے۔

"اگر وہ ہاتھ آ جائے تو اس کا کیا کیا جائے؟" کلکٹر نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں اسے دوبارہ جنگل کی عادت ڈال دوں گا۔ پھر اس کا پاگل پن ختم ہو جائے گا،" ٹھاکر اودل سنگھ نے ہیڈ ماسٹر والا سبق یاد کرنے کی کوشش کی۔

"آپ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ پھر آزاد ہو کر تباہی مچائے!" کلکٹر نے استہزا کے انداز میں کہا۔

ٹھاکر صاحب کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا کلکٹر کو معلوم ہے کہ وہ میرے ہاتھ آ کر نکل چکا ہے؟ پھر انھوں نے خود کو تسلی دی کہ کلکٹر نے یہ بات یوں ہی زواروی میں کہہ دی ہے۔

"سنیے جناب! راے عامہ کا زبردست دباؤ ہے۔ دیگر قصبوں والوں نے بھی شکایت کی ہے کہ نیلا ان کے یہاں بھی تباہی مچا رہا ہے۔ کل نیلا شہر میں بھی دیکھا گیا ہے۔ اب یہ معاملہ مقامی نہیں رہا۔ لیکن نیلا کیوں کہ آپ سے وابستہ ہے، اور اس کا مقام واردات خاص طور پر یہ قصبہ ہے، اس لیے آپ دونوں حضرات قصبے کے معزز شہری کی حیثیت سے اس کاغذ پر دستخط کیجیے کہ نیلے کی وحشیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے نیلے کو مارنا مناسب ہو گا۔ یہ درخواست وائلڈ لائف افسر کے نام ہے۔ میں ان سے اجازت نامہ پیشگی حاصل کر چکا ہوں۔ یہ دیکھیے..." انھوں نے کوٹ کی جیب سے سرکاری مہر والا ایک کاغذ دکھایا۔

محمود صاحب نے تیزی سے اور ٹھاکر صاحب نے مرے مرے ہاتھوں سے کلکٹر کے دیے ہوے کاغذ پر دستخط کیے۔ محمود صاحب نے شکر ادا کیا کہ کلکٹر اور ایس پی کسی نے بھی میونسپل بورڈ کے آفس کی توڑ پھوڑ کے بارے میں کسی راے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے دستخط کرنے کے بعد سوچا کہ یہ مرحلہ ختم ہو تو وہ جلد از جلد گڑھی اور حویلی کی ساری دولت نکال کر شہر کے اس بینک میں رکھ دیں گے جہاں پچھلے ہفتے ہی ایسے لاکر تقسیم ہونا شروع ہوے ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے نام کا اندراج نہیں کرنا پڑتا، بلکہ کوڈ نمبر دے دیا جاتا ہے۔

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جانور واردات کر کے چھپ کہاں گئے ہیں..." ایس پی صاحب بولے۔

"میں کچھ کہوں گا تو کہا جائے گا کہ میں نیلے کی حمایت میں بول رہا ہوں۔ آپ یقین کیجیے، میں نے رات کو چیخ پکار کے بعد اپنی کھڑکی سے تین نیلے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے،" ٹھاکر نے رات کا منظر یاد کیا اور جھرجھری لے کر بولے۔

"کیا وہ نیلے ہی تھے؟" ایس پی نے پوچھا۔

"نہیں... لیکن وہ جانور یقیناً تھے،" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"ممکن ہے ٹھاکر صاحب کا نیلا جنگل سے آور وحشی نیلوں کو لگا لایا ہو جو اس کے بدن کی موٹی چربی دیکھ کر لالچ میں آ گئے ہوں،" کلکٹر نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے قصبے کے عام جانوروں نے نیلے کی وحشت کی شہرت کا فائدہ اٹھایا ہو،" ایس پی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"لیکن یہ سب کچھ بہت خطرناک اور پراسرار ہے،" محمود صاحب نے کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ گفتگو نیلے اور دیگر جانوروں سے ہی متعلق رہے، میونسپل بورڈ آفس کی توڑ پھوڑ کا ذکر نہ آ پائے۔

"لیکن بنیاد وہ نیلا ہی ہے،" کلکٹر نے کہا لیکن دل ہی دل میں سوچا کہ دور دراز کی ساری بستیوں سے جن بربادیوں کی خبریں آ رہی ہیں ان سب کا سبب تو یہ اکیلا نیلا نہیں ہو سکتا۔ تمام علاقوں میں کل ملا کر کتنے پالتو نیلے ہیں؟

"وہ اگر ختم بھی ہو جائے تو اس کے ساتھ کے نیلے اور کانجی ہاؤس کے بجاروں کا بھی انتظام کرنا ہو گا،" ایس پی نے ان کا دھیان بٹایا۔

"ارے پہلے اس ایک نیلے کو ہی قابو میں کیجیے کپتان صاحب،" کلکٹر نے فکرمند مسکراہٹ کے ساتھ کہا جس میں کچھ کچھ طنز کی چمک بھی تھی۔

اس جملے کے بعد سب نے اپنے اپنے سر جھکا لیے تھے۔ خود کلکٹر صاحب کا سر بھی اٹھا ہوا نہیں تھا۔

دور آفس سے ملحق پارک کی سیڑھیوں پر کچھ شور سا ہوا۔ گڑھی کا پہرے دار ہانپتا کانپتا روتا چلّاتا بھاگا چلا آ رہا تھا۔

آفس میں گھس کر اس نے نمبردار کے پیر پکڑ کر کہا:

"نمبردار جی، نیلا گڑھی میں آ گیا ہے۔ بڑی بہو کے کمرے پہ ٹکر مار رہا ہے۔ پرتاپ بھیا اور بچے بھی کمرے ہی میں ہیں۔"

باہر سے کلکٹر کا باڈی گارڈ ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"شہر سے وائرلیس میسج آیا ہے کہ وہاں وہی واردات ہو گئی ہے۔"

کلکٹر اور ایس پی شہر روانہ ہونے سے پہلے تھانہ انچارج کو نیلا مارنے کا اجازت نامہ اور

ضروری ہدایتیں دے گئے۔ وہ جیپ پر چڑھتے چڑھتے وعدہ کر گئے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر پولیس کی مزید ٹکڑیاں بھیج دیں گے۔

ٹھاکر صاحب کے سینے میں پنکھے چل رہے تھے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ کانپتے ہوئے قدموں سے جیپ پر چڑھے اور چند ہی منٹوں میں، لیکن اپنے حساب سے کئی گھنٹوں میں، دیہات پہنچ پائے۔ گڑھی کے سامنے چھٹکی کا جھونپڑا چڑیا کے گھونسلے کی طرح الجھا الجھا پڑا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ دہشت زدہ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ جھونپڑے کے باہر چھٹکی کی کھوندی ہوئی لاش پڑی تھی۔ بچے کمرے میں بند تھے۔ اور پرتاپ اور بڑی بہو گڑھی کے دروازے کی سلاخوں سے لگے کھڑے کانپ رہے تھے۔ نیلے کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

"وہ ہمارے دروازے پر ٹکریں مار مار کر لہولہان ہو گیا تھا۔ دروازہ بہت مضبوط تھا، ٹوٹا نہیں۔ وہ گڑھی میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ شاید آپ کو ہی تلاش کر رہا تھا۔ چاروں طرف سے اس پر یورش ہے، بس آپ کو ہی اپنی پناہ سمجھتا ہے..." پرتاپ نے پھُولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

"جیسے ہی وہ گڑھی سے باہر نکلا ہم نے کمرے سے نکل کر گڑھی کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ چھٹکی کے جھونپڑے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا..." بڑی بہو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

پھر اس نے ڈر سے کانپتے ہوئے، شرم سے آنکھیں جھکائے ہوئے بتایا، "اپنے جھونپڑے میں چھٹکی ہر مہینے کپڑے کے چیتھڑے اڑس دیتی تھی۔ جیسے ہی وہ اس دفعہ کے چیتھڑے اڑس کر مڑی، نیلا پیچھے کھڑا تھا۔ وہ چیخ کر جھونپڑے میں گھس گئی اور ٹٹر بند کر لیا۔ نیلے نے گردن اٹھا کر ان چیتھڑوں کو سونگھا اور انھیں سونگھتے ہی دو پیروں پر کھڑے ہو کر دیوانوں کی طرح زمین پر لوٹیں لگانے لگا..." بڑی بہو بیان کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

تب پرتاپ نے واقعہ بیان کرنا شروع کیا، "پھر وہ اٹھا اور پیروں پر کھڑا ہو کر کسی ان دیکھے انسان سے لڑنے لگا جیسے کسی پر قابو پانا چاہتا ہو... پھر اس نے چھٹکی کی چیخیں سنیں۔ اس نے سینگوں کے ایک ہی ریلے میں ٹٹر توڑ دیا اور اگلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر چھٹکی کو کھوندنا شروع کر دیا۔ جب وہ بے دم ہو کر گر پڑی تو نیلے نے چھپر کا تنکا تنکا الگ کر دیا..." پرتاپ کی آنکھوں میں آنسو آ

گئے تھے جو مسلسل بہہ رہے تھے، مگر بیان کے زور میں وہ انھیں پونچھنا بھی بھول گیا۔

انچارج نے جھکی کی لاش کا پنچ نامہ کرایا اور شہر روانہ کر دیا۔ انچارج نے ٹھاکر صاحب کے پاس آ کر سرگوشی کی، "وہ آپ ہی کی چاہ میں ہے۔ شاید آپ کے قابو آ سکے۔ ویسے تو اب اسے مارنے کا اجازت نامہ بھی میرے پاس موجود ہے..."

کھیتوں کی طرف سے ہیڈ ماسٹر دوڑتے ہوئے آئے اور بتایا کہ انھوں نے ابھی ابھی نیلے کو مندر والے کھیت میں گھستے دیکھا ہے۔

پولیس کی کئی جیپیں رکیں۔ شہر سے کمک آ گئی تھی۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے سوچا، اس بیچ نیلے کو اپنی غذا کہیں نہیں ملی ہوگی اسی لیے وہ مندر والے اربر کے کھیت میں چلا گیا ہے۔ وہاں اب بھی ناج گڑ اور بادام رکھے ہوں گے اور ناند میں پانی بھی بھرا ہوگا... اور وہاں کوئی آدمی بھی نہیں ہوگا...

تھانہ انچارج نے گالیاں دے دے کر گاؤں کے مردوں کو ان کے گھروں سے نکالا... سب اس بات پر راضی ہو پائے کہ اربر کے کھیت تک ٹھاکر اودل سنگھ بھی جائیں گے۔

"کیا میں اسے مرتا ہوا دیکھ سکوں گا؟" ٹھاکر اودل سنگھ نے اپنے دل سے پوچھا۔ ان کے دل نے جواب دیا کہ شہر میں نئے طریقے کے لاکر آ گئے ہیں... انھوں نے کھیت پر جانے کی ہامی بھر لی۔

تھانہ انچارج نے سپاہیوں کو گاؤں کے چاروں طرف بندوقیں لے کر کھڑا کر دیا اور مختلف ہدایتیں دے کر سب کے مورچے درست کرائے۔

لاٹھی، ڈنڈا، سانٹھا، جو جس کے ہاتھ آیا لے کر اربر کے کھیت کی طرف چلا...

"تم دونوں بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں بند ہو جاؤ، مگر گڑھی کا دروازہ کھلا رکھنا... شاید وہ بھاگ کر ادھر ہی آئے۔ اگر وہ گڑھی میں آیا تو میں دروازہ بند کر کے رام کر لوں گا،" ٹھاکر صاحب نے پرتاپ اور بڑی بہو کو ہدایت کی۔

※

بانکا ہونے کے بعد ارہر کے کھیت سے نکلتے ہی تھوتھنی اور سر پر لاٹھیاں اور ڈنڈے لگاتار پڑے۔ سیاہ بدن پر جگہ جگہ خون اُبل رہا تھا۔ وہ بھاگا۔ اس کی ایک آنکھ بھی زخمی ہو گئی تھی اسی لیے وہ ٹیڑھا ٹیڑھا بھاگ رہا تھا۔ ٹھاکر اودل سنگھ اسے گاؤں کی طرف بھاگتا دیکھ کر پوکھر والے راستے سے تیزی کے ساتھ گڑھی کی طرف بڑھے۔ لاٹھیاں لیے ہجوم لمبے والے راستے سے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ نیلے نے چہرے سے بہتے ہوئے خون کی چادر کے پیچھے سے کچھ اجنبی شکلوں کو گاؤں کی سرحد پر دیکھا۔ اس نے کاوا کاٹا اور گڑھی کے پیچھے والے راستے یعنی ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہوا اور گڑھی کے صحن میں آ گیا۔ پرتاپ اور بڑی بہو بچوں کو کمرے کے اندر کر کے خود باہر کھڑے تھے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے رستے سے آ جائے گا۔ دونوں بجلی کی سی تیزی سے کمرے کی طرف بھاگے جس کے دروازے میں بچے کھڑے دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ بڑی بہو کا پیر ساڑی میں اٹکا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ پیچھے سے آتا ہوا پرتاپ اس سے ٹکرایا اور رک گیا۔ بہو کمرے کے اندر داخل ہو چکی تھی اور پرتاپ نیلے کے سینگوں سے اُلجھا ہوا تھا۔ بڑی بہو اضطراری طور پر کمرے سے باہر آئی تو بچے بھی ماں سے لپٹ کر باہر آ گئے۔ وہ گھوم کر بچوں کو پکڑ کر کمرے میں بھاگی۔ مڑی تو دیکھا کہ نیلا اپنی پچھلی ٹانگوں پہ کھڑا ہوا اگلے کھُروں سے پرتاپ کا سر پاش پاش کر چکا ہے۔ جب دُھول کچھ کم ہوئی تو بڑی بہو نے حیران حیران خالی خالی آنکھوں سے دیکھا کہ پرتاپ زمین پر پرانے لحاف کی طرح اُدھڑا پڑا ہے اور نیلا خون کی دھاریوں کے پیچھے سے اپنی آنکھوں کو پٹ پٹ کھول رہا ہے، بند کر رہا ہے اور پرتاپ کی لاش کے چاروں طرف ٹکراتا، الجھتا، لڑکھڑاتا ہوا چکر لگا رہا ہے، اور گڑھی کے دروازے سے نمبردار اودل سنگھ دیوانوں کی طرح چیختے چلاتے داخل ہو رہے ہیں۔

اسے بہت دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ایک آنکھ شاید بالکل ختم ہو گئی تھی اور دوسری سر سے بہنے والے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔

نیلے نے خون سے لتھڑی آنکھیں پٹ پٹائیں، اتنے زور سے سانس بھری کہ اس حصے کی

مٹی اُڑنے لگی، گردن کو جھٹکا دیا، دُم کو گردش دی اور سینگوں کو آگے کر کے پوری طاقت سے اُس آدمی سے ٹکرا کر دیوار تک روندتا چلا گیا۔ جب دیوار سے اس آدمی کا سر ٹکرا گیا تو سینگوں کو گھونپ گھونپ کر اس کی آنتیں نکال کر اپنے کھُروں سے کھوندتا رہا اور پھر وہاں کسی کو نہ پا کر ٹوٹی ہوئی دیوار کے راستے کو یاد کے سہارے تلاش کرتا ہوا گڑھی سے باہر نکل گیا۔

بڑی بہو اپنے بچوں کو لے کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکلی اور پرتاپ اور بابوجی کی لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر بچوں کو مضبوطی سے پکڑا اور آسمان کی طرف دیکھا۔

پولیس کی ٹکڑیاں اور گاؤں کا مجمع گڑھی کے دروازے پر اکٹھا ہو گیا تھا۔ انھیں علم نہیں تھا کہ اندر کیا ہوا۔ انھیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ نیلا پیچھے والے راستے سے نکل کر، تالاب پار کرتا ہوا، خون کی چپچپاہٹ سے بند ہوتی آنکھیں دھوتا ہوا زخمی حالت میں کدھر بھاگا ہے۔

پھر سب کو اس بات کی خبر ہوئی کہ زخمی، اندھا اور پاگل نیلا غائب ہو گیا ہے۔

تھانے دار نے تھکے تھکے ہاتھوں سے رائفل خالی کی اور سوچا کہ کیوں کہ وہ زخمی ہے اس لیے کہیں بھی مر سکتا ہے۔

گڑھی کے کچے صحن پہ ننگے پاؤں کھڑی بڑی بہو نے دونوں بچوں کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے، آنکھیں بند کیے، دل کڑا کر کے سوچا کہ کیوں کہ وہ اندھا ہے اس لیے اب کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔

بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو چھپایا اور سوچا کہ وہ پاگل ہے اس لیے کبھی بھی حملہ کر سکتا ہے۔ اور کیوں کہ وہ غائب ہے اس لیے کسی بھی گلی کو پار کرتے ہوئے، کسی بھی کھیت کی طرف جاتے ہوئے اور کسی بھی راستے پہ چلتے ہوئے اچانک بالکل سامنے، بالکل قریب کھڑا نظر آ سکتا ہے ــــ سینگ آگے کیے، سر نیوڑھائے اور اگلے کھُر فضا میں بلند کیے...

لیکن کسی کو بھی یہ سوچنے کی سکت نہیں تھی کہ نیلا گاؤں میں ہی ہے یا گاؤں کے پاس کسی کھیت میں چھپا ہوا ہے یا گاؤں کی سرحد سے دور قصبے تک پہنچ گیا ہے یا قصبے سے بھی آگے خون کے چھینٹے اڑاتا شہر کی طرف بھاگ رہا ہے یا اس سے بھی آگے...